فرد

شمارہ نمبر ۹ مئی ۲۰۱۵ء

انڈویجوئل لینڈ

انفرادی آزادی کے لئے کوشاں

پاکستان کا بادشاہ کون؟

In collaboration with

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT

Follow us on twitter and facebook **INDIVIDUALLAND**

فرد

شمارہ نمبر ۹ مئی ۲۰۱۵ء

ایڈیٹر:
سندس سیدہ

کوارڈینیشن: سید فہد الحسن
اویس محمود

ڈیزائین
عدیل امجد، ڈاٹ لائنز

پبلشر:
انڈیویجوئل لینڈ پاکستان

آئی ایس بی این ۹ ۳۴ ۹۵۸۲ ۹۶۹ ۹۷۸

فہرست

اداریہ
قانون سب سے بالاتر ہے! ۲
وہ ہم میں سے نہیں! ۴
مارنے والا بھی ہے مرہم رکھنے والے کی صفوں میں! ۶
کوئی بولے نہ بولے میں تو بولوں گا! ۸
کچھ جیلوں کے حوالے سے ۱۰
ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ۱۲
ڈرامے اور پاکستانی تحاریر: پاکستان کی عکاسی یا کچھ اور؟ ۱۴
میں اور میرا آنے والا کل ۱۶
ملالہ سے نفرت اور عافیہ سے محبت کیوں؟ ۱۸
دیر سے آئے پر کیا درست آئے جناب؟ ۲۰
عدالت کی تاریخ: فوج سے مانگو! ۲۳
پاکستان کا بادشاہ کون؟ ۲۵

Individualland
Creating space for the individual
نمبر ۱۲۔بی، سٹریٹ نمبر ۲۶، سیکٹر ایف ۱/۸، اسلام آباد

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT
کے تعاون سے

اداریہ

پاکستان نے دہشتگردی سے نمٹنے کے لیے پالیسی مرتب کرلی ہے۔ امید ہے کہ اب ہم اس لعنت سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ موذی مرض کینسر کی طرح ہے جو اپنی جڑیں پھیلاتا جاتا ہے لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ اس کو جڑ سے نکال پھینکا جائے۔ مجھے اس بات پر نہایت خوشی ہے کہ ہماری حکومت، فوج اور قوم یکجان ہو گئی ہے۔ حکومت کو ایسے اقدامات کرنے چاہئیں کہ کالعدم تنظیم میں شامل ہونے اور کالعدم تنظیموں سے امداد لینے کی بجائے ہمارے لوگ جو کالعدم تنظیموں کی صفوں میں نظر آتے ہیں وہ ملک و قوم کی سلامتی کے لیے متحد ہو جائیں۔ قومی لائحہ عمل کے تحت بظاہر بہت سے اقدامات ہوتے دکھائی دے رہے ہیں جن میں دہشتگردوں کو پھانسیاں دینے، تنظیموں کو کالعدم قرار دیے جانے، افغان باشندوں کی اپنے ملک میں روانگی، شمالی وزیرستان کے لوگوں کو ان کے علاقے میں واپس بھیجنے کے لیے کیے جانے والے اقدامات کے ساتھ ساتھ کالعدم تنظیموں کے فنڈز پر پابندی عائد کرنا شامل ہیں۔

قومی لائحہ عمل پر عمل ہونے کے باوجود ایک دفعہ پھر ہمارے مسیحی بھائیوں پر قیامت ٹوٹی اور اس کے نتیجے میں ہونے والے شر، انتشار اور ردعمل نے ہمیں پھر دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بچوں کی شہادتوں کے طفیل جس سمت کا تعین اور مقصد کے حصول کی جانب پیش قدمی ہوئی تھی کوئی اور ویسا ہی سانحہ ہمیں فرقہ واریت اور مذہبی تصادم کی جانب دھکیل دے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم مذہبی ہم آہنگی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہ جائیں اور ملک و قوم کے پرخچے اڑا دیے جائیں۔

ایسا کیوں ہو رہا ہے کہ تمام اقدامات کے باوجود کالعدم تنظیمیں اپنے کاموں میں سرگرم نظر آ رہی ہیں؟ ان کے سوشل میڈیا، اخبارات، رسائل اور بلاگوں میں بھی قومی لائحہ عمل کی شقوں پر نقطہ نظر بیان کیے جا رہے ہیں۔ ان کے ادارے کے لوگ ہمارے ہی درمیان دندناتے پھر رہے ہیں، ان کی سرگرمیاں منجمد کیوں نہیں ہو رہیں؟ کہیں ان اداروں کو کہیں سے ایسے فنڈ تو نہیں پہنچ رہے جن سے حکومتی ادارے بے خبر ہیں یا بے خبر رہنے کا دکھاوا کر رہے ہیں؟ کالعدم تنظیموں کا میڈیا اگر سر عام اپنا نقطہ نظر دے سکتا ہے، اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکتا ہے تو کیا ہمارا آزاد و ذمہ دار اور خود مختار میڈیا قومی لائحہ عمل پر ہر لمحہ ہونے والی پیش رفت کے حوالے سے عوام کو آگاہ کیوں نہیں کر سکتا؟ ایسی پیش رفت جس سے عوام کو ثبوت ملے کہ واقعی اگر اب دہشتگرد چھپ کر بھی وار کریں گے تب بھی ہماری نگاہ سے نہیں بچ سکتے۔ کیا صرف پھانسیاں دے دینا اور فوجی عدالتوں کا قیام اس مسئلے کا مستقل حل ہے؟ حکومتی اقدامات پر کہیں کوئی بات کیوں نہیں کی جاتی؟ کہیں کالعدم اداروں کے دفاتر سیل ہوتے کیوں نہیں دکھائے گئے؟ کیا ہماری عوام آگاہ ہے کہ کالعدم تنظیموں میں کن کن تنظیموں کے نام ہیں؟ کیا میرے گھر کے باہر لگا پوسٹر کسی کالعدم تنظیم کا تو نہیں؟

پاکستان کے عوام کی اسی بے یقینی کی کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے تمام آرٹیکلز لکھے گئے۔ اگر اب ہم نے ایک ہو کر ملک کو سنوارنے کا تہیہ کر ہی لیا ہے تو وہ وقت اب دور نہیں جب ہم اپنی منزل پا لیں گے اور اس ملک پر امن کا جھنڈا لہرائیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مناسب اور دیرپا اقدامات کیے جائیں۔

سندس اسیدہ

قانون سب سے بالاتر ہے!

تحریر: ریحان علی

پاکستان کی تاریخ کا ایک اور سیاہ دن ۔۴ جنوری ۲۰۱۵ء کو سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر کی چوتھی برسی کے موقع پر ایک پر امن تقریب منعقد کی جارہی تھی جس پر نامعلوم شر پسندوں نے حملہ کیا۔اس واقعے میں کئی انسانی حقوق کے کارکنان ،سول سوسائٹی کے نمائندوں اور میڈیا اہلکار زخمی ہوئے کیونکہ شر پسند عناصر نے ان کو ڈنڈوں سے مارا۔ انھوں نے پولیس اہلکاروں کی موجودگی میں پوسٹر اور بینر بھی پھاڑے۔

اس ملک میں مذہبی عدم برداشت کی حد ہے کہ اکیسویں صدی میں لوگوں کو ان کے پیاروں کی برسی میں بلا خوف وخطر شرکت کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔اس واقعے نے نہ صرف ترقی پسند پاکستانیوں بلکہ پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے کہ ہم بحیثیت قوم کس جانب جارہے ہیں۔ایسے واقعات ہمارے معاشرے کی خوفناک تصویر پیش کرتے ہیں کہ کس طرح ملازم اور مذہبی عدم برداشت نے قائدِ اعظم محمد علی جناح کے پاکستان میں بسیرا کرلیا ہے۔مذہبی انتہا پسندوں کے منفی کردار میں اضافہ معاشرے میں ایک بیماری ہے اور ان لوگوں کے بنیاد پرست عقائد صرف ان کے حق میں جاتے ہیں جو کہ معاشرے کے لیے نقصان دہ ہیں۔

سب سے زیادہ پریشان کن بات اس واقعے کی یہ تھی کہ پنجاب پولیس نے ان شر پسندوں کے خلاف قانونی کاروائی نہیں کی جنھوں نے ان کے سامنے حملہ کیا۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے شہریوں کی حفاظت کرنے کی بجائے جانبدارانہ رویہ اپناتے ہیں اور شر پسند عناصر کے خلاف کاروائی نہیں کرتے جو انتہائی بدقسمتی کی بات ہے۔اتنا کچھ ہونے کے بعد یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ملک میں قانونی حکمرانی موجود نہیں ہے۔جس کا جو دل چاہے وہ اس میں مصروف ہے جیسے کہ کرپشن ،قتل ،چوری اور پھر ستم یہ کہ کوئی ان کو روکنے والا نہیں ہے۔

قانون کی حکمرانی کا مطلب ہے کہ ہر شہری قانون کے تابع ہو جس میں قانون ساز بھی موجود ہیں۔اگر قانون کی حکمرانی ہوتی تو آسیہ بی بی جو ایک پاکستانی ہے اسکو توہین رسالت کے جرم میں پاکستانی عدالت نے موت کی سزا سنائی اس کو انصاف ملتا اور وہ جیل میں نہ سڑتی۔اسی طرح سلمان تاثیر جو آسیہ بی بی کے دفاع میں سامنے آئے ان کے اوپر بھی توہین رسالت کا الزام لگا دیا۔ان کی رائے تھی کہ اس قانون میں تبدیلی لائی جائے لیکن ان کے اس موقف نے معاشرے کو دو ٹکروں میں بانٹ دیا اور ان کو قتل کر دیا گیا جس پر معاشرے میں اکثریت کی رائے ہے کہ ان کو قتل کرنا جائز تھا اور ان کے قاتل ممتاز قادری کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔وکیلوں نے بھی اس پر پھول برسائے ،جو بہت ہی حیران کن بات ہے۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں قانون کی حکمرانی موجود نہیں ہے کہ اب ایک قاتل کو ایک ہیرو کے طور پر پیش کیا جارہا ہے اور مقتول کو ذلیل کیا جارہا ہے۔

قانون کی حکمرانی کی عدم موجودگی کے بارے میں بات کرتے ہوئے چند دن پہلے ایک اور افسوسناک واقع پیش آیا جب طالبان نے لاہور میں دو گرجہ گھروں پر حملہ کیا جس میں ۱۵ لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ۷۰ زخمی ہوئے۔مسیح برادری کے پاس تمام حقوق ہیں لیکن افسوس کہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔اس طرح کے حملوں کی پرزور مذمت کرنی چاہیے اور حکومت کی طرف سے شہریوں کی حفاظت کے لیے سخت اقدامات اٹھانے چاہییں تاکہ اس طرح کے واقعات پھر نہ ہوں اور مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے ،لیکن لوگوں کو بھی قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے جیسے ہم نے مسیح برادری کو دیکھا جب وہ سڑکوں پر آئے اور سرکاری املاک پر توڑ پھوڑ کرنا

شروع کردی، پولیس اہلکاروں کے ساتھ لڑے اور دو لوگوں کو جان سے مار دیا۔ دونوں مرنے والے آدمیوں کا کسی بھی عسکریت پسند تنظیم کے ساتھ تعلق نہیں تھا اور وہ بے قصور تھے۔ اگر ملک میں قانون کی حکمرانی موجود ہوتی تو ایسے خوفناک واقعات پیش نہ آتے کیونکہ لوگوں کو معلوم ہوتا کہ ان کو انصاف ملے گا اور سخت سزائیں دی جائیں گی۔ ان لوگوں کو بھی خوف ہوتا جو کرپشن اور مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں اور مذہبی انتہا پسندی بھی کم ہو جاتی۔ اگر ہم نے اپنے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن ہوتے ہوئے دیکھنا ہے اور مذہبی انتہا پسندی سے چھٹکارا پانا ہے تو وقت آ گیا ہے کہ ریاستی ادارے قانون کی حکمرانی قائم کرنے پر توجہ مرکوز کریں جو سب لوگوں پر لاگو ہو جائے خواہ امیر ہو یا غریب، اگر ایسا نہ ہوا تو ہم مسائل کا شکار ہی رہیں گے۔

مصنف انڈویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

وہ ہم میں سے نہیں!

تحریر: حمزہ خان

میں ہوں یا میں نہیں ہوں؟ میں کون ہوں؟ میں پہلے مسلمان ہوں اور پھر پاکستانی۔ کیا مجھے اردو بولنی چاہئے یا اپنی مادری زبان؟ میں اس دھرتی کا بیٹا ہوں یا کوئی مہاجر؟ کیا میں جمہوریت پسند ہوں یا آمریت کے حق میں ہوں؟ کیا میں طالبان میں سے ہوں؟ اگر ہاں تو کیا میرا شمار اچھے طالبان میں ہوتا یا برے میں؟ گویا یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں کافی الجھنوں کا شکار ہو گیا ہوں۔ اور میری الجھن مجھے ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیتی ہے جو میری بات سے اتفاق نہیں کرتے۔ لیکن پھر بھی سوال تو وہیں رہ جاتا ہے کہ کیا میں یہ بیان کرنے کے قابل ہوں کہ میں کون ہوں یا نہیں؟

ان تمام حقیقتوں سے قطع نظر کم از کم میں با آوازِ بلند یہ کہنے کے قابل ضرور ہو گیا ہوں کہ اب ہماری حکومت، افواج، سول سوسائٹی، میڈیا، عورتیں بچے، بوڑھے جوان سبھی انتہا پسندی کی لعنت کے خلاف متحد ہو گئے ہیں۔ آرمی پبلک اسکول میں ہونے والے افسوسناک واقعے نے ہم سب کو متحد کر دیا ہے آپ چاہیں اسکو کوئی بھی نام دیں دہشتگردی، عسکریت پسندی یا انتہا پسندی حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے عرصہ دراز سے اس ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس موذی مرض کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔

اگر پاکستان میں موجودہ دہشتگردی کے حالات پر اور حکومتی اقدامات پر بات کروں تو میں موجودہ حکومت کا مشکور ہوں کہ انہوں نے پاکستان کے دارالخلافہ میں میٹرو بس سروس کو ہی دہشتگردی کے خاتمے کی جانب مناسب قدم سمجھا کیونکہ حکومت ان وسائل کو استعمال کرنے کا اس سے بہتر حل نہیں سوچ سکتی تھی جبکہ سینکڑوں افراد صاف پانی، خوراک اور بجلی کے بغیر زندگی گزار سکتے ہیں۔ خیر! یہ موضوع پھر کبھی!۔ موجودہ صورتحال میں موجودہ حکومت، فوج اور دیگر سیاست دانوں کے دہشتگردی کے خاتمے کی جانب متفقہ کوششوں کو سراہنا چاہوں گا۔

فروری ۲۰۱۵ء میں ہمارے وزیرِ داخلہ نے وائٹ ہاؤس میں دہشتگردی کے سدِ باب کے سربراہی اجلاس میں شرکت کی۔ آرمی پبلک اسکول پر ہونے والے دہشتگردی کے حملے کے پیشِ نظر اس اجلاس کا مقصد پاکستان میں دہشتگردی کے خاتمے کے لیے بنائی گئی جامع حکمتِ عملی پیش کرنا اور منصوبہ بندی کو بیان کرنا تھا۔ اخبارات اور آن لائن ذرائع میں اجلاس کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس میں صرف تقریر پر انحصار کرنے کے بجائے نیشنل ایکشن پلان پیش کیا گیا ہے۔ نیشنل ایکشن پلان ملک میں کام کرنے والی کالعدم تنظیموں کی جانب فوری کاروائی کا مطالبہ کرتا ہے۔ جس میں کالعدم تنظیموں کے تمام فنڈز کو منجمد کرنے کی بات کی گئی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ کسی نے انتظامیہ کو یہ مشورہ بھی پیش کیا ہے کہ غیر قانونی رقم اور اس کی منتقلی کو بھی منجمد کیا جائے، اور یہ حقیقت ان پر آشکار ہوئی کہ کالعدم تنظیمیں صرف دعاؤں اور نمازوں کے سہارے نہیں چلتیں۔ میڈیا کو بھی دہشتگردی سے متعلقہ واقعات کو دیکھانے سے باز رہنے کا کہا گیا ہے۔ نیشنل ایکشن پلان میں جتنے بھی اہم اقدامات اٹھانے کا ذکر کیا گیا ہے کم از کم ان سے یہ بات تو ظاہر ہوتی ہے کہ ہم اچھے طالبان اور برے طالبان کی بحث سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ نیشنل ایکشن پلان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان لوگوں سے سختی سے نمٹا جائے گا جو پرتشدد کاروائیوں میں ملوث ہوں گے۔ بالآخر میرے پنڈورا باکس کے ایک سوال کا جواب مل گیا کہ ناں تو میرا تعلق ناں تو اچھے طالبان سے ہے نہ ہی برے اور اگر میں طالبان ہوں تو اس ملک کے لئے اچھا نہیں ہوں۔

میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ مجھے پاکستانی ہونے پر فخر ہے۔ کئی سالوں کے بعد پاکستان کے عالمی تشخص کو بحال کرنے کے لیے کوششیں کی جانے لگی ہیں۔ اجلاس کے دوران اور میڈیا کے سامنے پاکستان کا سرکاری موقف دہشتگردی کے مسئلے پر صاف اور واضح تھا۔ کم از کم اب بین الاقوامی برادری کو یہ پتہ چل گیا ہے کہ پاکستان نیند سے بیدار ہو گیا ہے اور دہشتگردی کے چیلنج سے نمٹنے کے لیے پرعزم ہے۔ پاکستان میں اس حوالے سے کوششیں کی جا رہی ہیں، پوری قوم کراچی میں دہشتگردی کے خلاف کیے جانے والے آپریشن کی گواہ ہے۔ پھر وزیرِ داخلہ چھاپے کے بارے میں بات کرتے ہوئے پرامید نظر آ رہے تھے انہوں نے اسکا اعادہ بھی کیا کہ وہ آپریشن انجام تک پہنچے گا۔ میں پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے پاک فوج اور حکومت کی دہشتگردی کے خاتمے کی تمام کوششوں کی حمایت کرتا ہوں۔

تاہم میرے ملک میں موجودہ صورتحال کچھ بہتر نہیں ہے۔ حال ہی میں انتہا پسندوں نے شعیہ کمیونٹی اور مسیحی برادران پر وحشیانہ حملوں سے ۱۱۴ افراد کے قتل اور ۷۰ سے زائد کو زخمی کر دیا ہے ۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سب متحد ہو جائیں۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

مارنے والا بھی ہے مرہم رکھنے والے کی صفوں میں!

تحریر: آئمہ سید

تمام ٹیلی ویژن چینل ایک ہی خبر دیکھا رہے تھے، ہر گھر میں سوگ کی فضاء تھی ہر بچہ اور بڑا اسی پر تبصرہ کرتا دکھائی دیتا تھا۔ پشاور میں آرمی پبلک اسکول پر دہشتگردوں نے حملہ کیا تھا اور سینکڑوں معصوم بے گناہوں کو ابدی نیند سلا دیا تھا، اس قدر درندگی؟ کیا یہ سب کرنے والے انسان کہلائے جانے کے قابل ہیں؟ اتنی سفاکی سے قتلِ عام کرنا کیا کسی مذہب، معاشرے، قوم و ملک کے لیے جائز عمل ہوسکتا ہے؟ اگر یہ کسی ناکردہ گناہ کی سزا یا بدلہ تھا تو کیا جزا اور سزا کا حق ان کو حاصل ہے جنہوں نے یہ سب کام کیا؟ مجھے نہیں معلوم کہ سینکڑوں ماؤں کے لختِ جگر ابدی نیند سلا دینے کے پیچھے کون سی آگ تھی، جس کو بجھانے کے لیے ان بہادر ماں باپ کے حوصلے آزمائے گئے جن میں سے زیادہ تر باپ ملک و قوم کی سلامتی کے لیے خون پسینہ ایک کر رہے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان ماؤں کا کیا قصور تھا جو اپنے بچوں کے شاندار مستقبل کے خواب اپنی پلکوں پر سجائے بیٹھی تھیں۔ کتنی ہی ماؤں کے خوابوں کے جنازے نکلے تھے، ان کے ارمان انکے پیاروں سمیت منوں مٹی تلے دفنا دیے گئے تھے۔ اس قدر بے بسی اور بے کسی کا عالم تھا کہ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ نا جانے میری اس بات میں کتنی حقیقت ہے؟ کیا واقعی ہر آنکھ اشکبار تھی؟ اس سانحے کے بعد ہونے والے بے شمار واقعات ایسے تھے جنہوں نے مجھے میرے اس جملے پر بار بار سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ کیا واقعی "ہر" آنکھ اشکبار تھی؟

میرے لیے یہ ایک دھچکا تھا کہ میں کالعدم تنظیم کے سماجی ادارے کو آرمی پبلک اسکول میں امداد فراہم کرتے دیکھ رہی تھی ان کے ادارے کی جیکٹ پہنے لوگ فخر سے اپنی پہچان اپنے سینوں پر سجائے ہمارے درمیاں دندناتے پھر رہے تھے، خدارا ان کو کوئی روکے! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو مارنے والا ہے وہ ہی اٹھانے والوں کی صف میں بھی کھڑا ہے؟ شاید جو لوگ کھڑے دیکھائی دے رہے تھے ان کا کوئی قصور نہ ہو اور کالعدم ادارہ بے روزگاری کی لعنت سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنایا ہو ورنہ انجان ہوں کہ وہ کس دلدل میں پاؤں رکھ رہے ہیں اور اس سے بچنا کس قدر مشکل ہے۔ لیکن ہمارا میڈیا؟ میڈیا کیسے ان کے لوگوں کو اسکول میں امداد فراہم کرتے صاف دیکھا رہا تھا۔ میں ایک عام شہری ہوں اگر مجھے معلوم ہے کہ کوئی جماعت کالعدم ہے اور اس کا تعلق کن کن جماعتوں سے یا اداروں سے ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میڈیا کو معلوم نہیں کہ کون سا ادارہ کالعدم ہے؟ صرف یہ ہی نہیں بلکہ ستم یہ کہ ننھے شہداء کے نمازِ جنازہ کی تصویر جو پاکستان کے مایا ناز انگریزی اخبار میں شائع ہوئی تھی اس میں بھی کالعدم تنظیم کے لوگوں کو نمازِ جنازہ ادا کرتے دیکھایا گیا، مجھے اس بات پر بالکل بھی اعتراض نہیں کہ وہ لوگ نمازِ جنازہ میں شرکت کیوں کر رہے تھے بلکہ اعتراض اس بات پر ہے کہ وہ لوگ وہاں بھی اپنے ادارے کی جیکٹ پہنے ان کی نمائندگی کرتے دیکھائی دے رہے تھے۔ کیا میڈیا والوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ سماجی تنظیم کس کی ہے اور کس طریقے سے کام کر رہی ہے؟ جبکہ اس تنظیم کا کام کوئی ڈھکا چھپا نہیں وہ اپنی کالعدم تنظیم کے نام سے اپنے ادارے کا نام اور ان کے لیڈروں کا تعلق خود واضح کرتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کالعدم اداروں سے تعلق واضح کرنے کا مقصد کیا ہے؟ ہماری نظروں میں دھول جھونکنا یا ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنا؟ وہ لوگ جو ایسے اداروں کے ساتھ کام کرتے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ جس ملک کے شہری ہیں اسکی حکومت کی جانب سے ان تنظیموں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ہم حکومت کے خلاف محاذ کھڑا کر کے ان جماعتوں میں شمولیت اختیار کریں۔

پاکستان میں کام کرنے والے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی جہاں تک رسائی نہیں ہے، کالعدم ادارے ان علاقوں میں بھی کام کر رہے ہیں، تھر میں قحط سالی ہو، آرمی پبلک اسکول کا سانحہ یا پھر کسی امام بارگاہ پر خودکش حملہ ہو کالعدم تنظیم سے منسلک فلاحی ادارے کی ایمبولینسیں اور لوگ وہاں امداد فراہم کرنے پہنچ جاتے ہیں، یہ بات مجھے کسی خفیہ ادارے نے نہیں بتائی یہ معلومات مجھے میڈیا نے دی ہے کیونکہ سرِ عام کسی بھی کالعدم ادارے کے لوگوں کو امداد فراہم کرتے ہوئے دیکھایا جاتا ہے، ان کے لیڈروں کی

رائے اور بیانات ٹاک شوز میں شامل کیے جاتے ہیں۔ اکثر اخبارات میں ان کے انٹرویوز چھاپے جاتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے اور حکومتی ادارے ان اداروں کی سرگرمیوں سے ناواقف ہوں اور انکو روک نہ سکیں؟ شاید اسکی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ایک خاص تنظیم جو کہ نہایت سرگرم ہے اس کا نظریہ بھارت کے خلاف جنگ کرنے کا ہے، کشمیر میں جہاد کے نام پر بھیجے جانے والے نوجوان ان ہی رجسٹرڈ کالعدم اداروں کے ہوتے ہیں جو بعد میں ان ہی اداروں کی جانب سے جنگ لڑنے کے بعد غازی اور شہید کے سرٹیفکیٹ حاصل کرتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری حکومت اور ہماری فوج ان نوجوانوں کو ضرورت پڑنے پر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے اور بھارت کے خلاف لڑنے کے لیے بھی ان ہی تنظیموں کے نوجوانوں کو استعمال کیا جاتا ہے؟ کچھ ایسے ادارے بھی ہیں جو نام نہاد جہاد کے نام پر پاکستان کے دشمن ممالک سے جہاد کررہے ہیں لیکن پاکستان میں وہ بظاہر سماجی اور فلاحی کاموں میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ایک وجہ ہوسکتی ہے کہ ایجنسیاں ان کی جانب سے اس لیے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں کہ وہ بظاہر دہشتگردی میں ملوث تو نہیں دیکھائی دیتے لیکن اگر اس بات کو سمجھا جائے کہ وہ نوجوانوں کو نفرت پھیلانے والے ادبی مواد اور اپنے نظریے سے کس طرح اشتعال انگیز رویوں پر اکساتے ہیں تو یقیناً تشویشناک بات ہے جس کی روک تھام کے لیے مناسب اقدامات کرنے ہوں گے۔

کالعدم تنظیمیں نوجوانوں کی کیریر کونسلنگ کرتی ہیں، ان کو آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کرتی ہیں، ان کے اسکول ہیں، کالجوں میں ان کے اسٹوڈنٹ گروپس ہیں، نوجوانوں کو کالعدم تنظیموں کی جانب سے غیر نصابی سرگرمیاں فراہم کی جاتی ہیں۔ کیا یہ کام حکومت کا نہیں؟ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں سول سوسائٹی میں کام کررہی ہوں لیکن پھر بھی ہر کام کی ذمہ داری حکومت کے کندھوں پر ڈال رہی ہوں۔ اسکے پیچھے بھی ایک وجہ ہے حکومت کی کچھ ذمہ داریاں ہیں جن کو پورا کرنا ان کا فرض ہے ہمارا کام محض انہیں ذمہ داریوں کا احساس دلانا ہے۔ اور جہاں تک ہوسکتا ہے غیر سرکاری ادارے تگ و دو کرتے رہتے ہیں کہ مسائل کی نشاندہی کریں اور ان کے حل کے لیے اقدامات بھی اٹھاتے رہتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ عوام اور حکومت کے درمیان کا خلاء ہے جس کا فائدہ کالعدم تنظیمیں اٹھا رہی ہیں اور نوجوانوں کو استعمال کررہی ہیں۔ ہم اس معاشرے میں رہتے ہیں جہاں کسی بھی نوجوان کا مذہبی سرگرمیوں کی جانب رجحان ہونا بالکل بھی مشکوک تصور نہیں کیا جاتا اور کیا بھی نہیں جانا چاہیے۔ لیکن اگر ہمارے نوجوان نام نہاد جہاد اور مذہب کے نام پر استعمال ہونے لگیں تو ضرورت اس امر کی ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے اور حکومتی ادارے اسکا نوٹس لیں۔ کالعدم تنظیموں کی ویب سائٹس ہیں سوشل میڈیا پر بے شمار گروپ، فیس بک اور ٹوئٹر پیج، اور کالعدم اداروں کے سرگرم کارکنان جو کہ اپنی پوسٹ میں اپنے دوستوں کو ٹیگ کر کے اپنا نظریہ سوشل میڈیا پر عام کرتے ہیں۔ اگر ایک ویب سائیٹ یا سوشل میڈیا کا پیج بند ہو جاتا ہے تو ایک نئے نام سے نیا پیج بنا لیا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے کیا وجوہات ہیں کہ کوئی مناسب حکمتِ عملی کیوں اختیار نہیں کی جاتی؟ میرے خیال سے تمام اداروں کو متحد ہو کر کام کرنا چاہیے اور مختلف ناموں سے کام کرنے والے کالعدم اداروں کے خلاف کاروائی کی جانی چاہیے۔ جو کہ ابھی بالکل پہلے مرحلے میں ہے۔ جس تیزی سے کالعدم ادارے کام کررہے ہیں حکومت کو اس سے زیادہ برق رفتاری دیکھانے کی ضرورت ہے۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کررہی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

کوئی بولے نہ بولے میں تو بولوں گا!

تحریر: عاطف فاروق

رائف باداوی ایک عربی مصنف، بلاگر اور ایک سرگرم کارکن ہے جس کو سال ۲۰۱۲ء میں اس کی آن لائن تحریروں جن کو ریاست کے خلاف سمجھا جاتا تھا جس کی وجہ سے اس کو جیل میں قید کیا تھا۔ جنوری ۲۰۱۵ء میں اس کو آزادی اظہار کے بارے میں بلاگ لکھنے پر عوام کے سامنے ۵۰ کوڑے مارے گئے۔ اس وقت وہ ۱۰ سال قید کی سزا کاٹ رہا ہے ،اس کو ہزار کوڑوں کی سزا دوبارہ سنائی گئی ہے اور اس کو ایک ملین سعودی ریال کا جرمانہ بھی ہو چکا ہے۔ اس پر کسی بھی قسم کے ذرائع ابلاغ استعمال کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ مزید یہ کہ وہ ۲۰۳۴ء تک سفر نہیں کر سکتا۔

ایک اور واقعے میں اویجت رائے جو ایک ممتاز بنگلا دیشی امریکی بلاگر ہے جو مذہبی بنیاد پرستی کے خلاف اپنے خیالات کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ بک فیر سے واپس آ رہا تھا اس کو فروری ۲۰۱۵ء کو ڈھاکہ میں موت کے گھاٹ اتار لیا گیا تھا۔ ایک اسلامی عسکریت پسند گروپ "انصار بنگلا ۷" نے اس حملے کی ذمہ داری قبول کی۔ رائے کا جرم یہ تھا کہ وہ "بلاگ مکتو مونا" کا بانی تھا اور آزادیِ خیال، امن اور برداشت کو فروغ دیتا تھا۔

یہ دونوں واقعات فرانس میں ہونے والے چارلی ہیبڈو کے واقع کے کچھ عرصے بعد پیش آئے اور ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اظہارِ رائے کے لیے اٹھنے والی آوازوں کو تشدد اور جبر سے خاموش کیا جا رہا ہے۔ باداوی کے ساتھ جو واقع پیش آیا ہے وہ ظالمانہ ریاستی جبر کی مثال ہے۔ جہاں مذہبی طاقت کا مرکز واضح کرتا ہے کہ کیا قابل قبول ہے اور کیا نہیں، اور جو ان حدود سے تجاوز کرتے ہیں اور ان کے خلاف بات کرتے ہیں یا تنقید کرتے ہیں، ان کو عوام کے سامنے کافی شدید اور وحشیانہ انداز میں سزا دی جاتی ہے اور عبرت کا نشانہ بنایا جاتا ہے تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ مجرموں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ مختصراً یہ کہ آزاد سوچ اور بامعنی بحث و مباحثے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

سعودی ریاست کے اختیارات آمریت پر مشتمل ہیں اور وہ مکمل طاقت سے حکمرانی کرنا چاہتے ہیں جس میں طبعی وسائل، ریاستی مشینری اور لوگوں کے خیالات بھی ان کے کنٹرول میں ہوں۔ دوسروں کے حقوق کی پاسداری نہ کرنا بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے اور اس کی مخالفت کرنے کی ضرورت ہے۔ دن کے اجالے میں رائے کا قتل ہونا بہت پریشان کن اور افسوس ناک ہے۔ یہ مذہبی جنونیت کو فروغ دینے والے نظریات کی نمائندگی کرتا ہے۔ انتہا پسندوں کے خیال میں رائے کے سیکولر خیالات دنیا کے لیے نقصان دہ تھے۔ اس معاملے میں حملہ کرنا صرف سیاسی نہیں تھا بلکہ ذاتی بھی تھا۔ حملہ کرنے والوں نے رائے سے ہمدردی والوں کو صرف ایک وارننگ میسج نہیں بھیجا بلکہ یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ اس سے ان کے جذبات مجروح ہوئے ہیں اور یہ اللہ کی طرف سے حکم تھا۔ چارلی ہیبڈو کے واقع کے بعد اس پر بہت بحث ہو رہی ہے کہ کس طرح متاثرین پر مسائل درپیش ہوں گے اور ان کو اس کے لیے تیار ہونا چاہیے تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب ہے کہ اظہار رائے کی آزادی کو ایک حد سے تجاوز نہیں ہونا چاہیے اور کچھ خیالات، تصورات اور اداروں کو تنقید کا نشانہ نہیں بنانا چاہیے۔

یہ درست ہے کہ اظہار رائے کی آزادی کو کسی کے جذبات مجروح کرنے کے لیے استعمال کرنا قابل مذمت ہے۔ لبرل نقطہ نظر اظہار رائے کی آزادی کو فروغ دیتا ہے، اس کی وجہ ہے کہ ہر انسان کو اپنے خیالات کے اظہار کرنے اور جمہوری عمل میں حصہ لینے کا حق ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر انسان کو کچھ تصورات پر تنقید کرنے کا حق ہونا چاہیے ۔تنقید کرنا ضروری ہو جاتا ہے جب کچھ تصورات اور خیالات کے مضمرات معاشرے کے لیے نقصان دہ ہوں جس کی وجہ سے معاشرے کی ترقی اور پیش رفت رک جاتی ہے۔ تنقید اس طرح کی جانی چاہیے جو معاشرے کے لیے مثبت ہو۔

سماجی، اقتصادی اور سیاسی پیس رفت شکوک وشبہات پر مبنی ہے۔ جو قائم قوانین ہیں ان کو چیلنج کرنے کی ضرورت ہے اور جو سخت رویے نظریات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ان کا احتساب کرنا ضروری ہے۔ دنیا میں ہر قسم کے خیالات اور تصورات پر بحث اور تنقید کرنا ہر کسی کا حق ہے۔ ہر انسان کو حق ہے کہ وہ ایسی تنقید نہ سنے جو اسے بری لگتی ہے ۔ایک سیارے پر جہاں ۷ بلین انسان بستے ہیں ضروری نہیں ہے کہ ہر کسی کے خیالات ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہوں، لہذا برداشت اور رواداری ہونے کی ضرورت ہے۔ جو ناانصافی اور ظلم اور بحث رائے اور رائف باداوی کے ساتھ ہوا ہے اس سے پتا چلتا ہے کے کس طرح کے مسائل ۲۱ صدی میں درپیش ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ آزادی رائے کو ایک معنی خیز گفتگو میں تبدیل کریں اور انتہا پسندی، تشدد کے خلاف لڑیں اور اجتماعی ترقی کی طرف راہ ہموار کریں۔

مصنف انڈویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

کچھ جیلوں کے حوالے سے

تحریر: سندس سیدہ

اگر جیلوں کی بات کی جائے تو ذہن میں قیدیوں کا ایسا نقشہ آتا ہے کہ وہ جیل کی سلاخوں کی پیچھے قید نہایت ظلم وستم سہ رہے ہوں گے لیکن ایک ایسی جیل بھی موجود ہے جہاں قیدی اپنے خاندانوں کے ساتھ جھونپڑیوں میں زندگی گزارتے ہیں اور کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ میں کسی ترقی یافتہ ملک کی بات نہیں کر رہی بلکہ یہ جیل پاکستان کے صوبہ سندھ کے ایک شہر بدین کے پاس موری کے علاقے میں واقع ہے۔ جیل خانہ جات کے افسر سے بات کرتے ہوئے یہ بات سامنے آئی ہے جیل کو دی گئی زمین کی اراضی ۳۰۳۲ ایکڑ کے لگ بھگ ہے۔ یہ پاکستان کی واحد جیل ہے جہاں پر قیدیوں اور پولیس کے پاس اسلحہ موجود نہیں ہے۔ بدین میں قیدی جب ایک خاص مدت گزار لیتے اور ان کا رویہ بھی اچھا ہوتا تھا تو ان سے قرآنِ پاک پر حلف لیا جاتا تھا کہ وہ جیل سے نہیں بھاگیں گے۔ اسکے بعد ان کو اجازت ہوتی تھی کہ وہ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ رہیں اور وہاں کھیتی باڑی کریں جس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا ایک حصہ حکومت کا، ایک قیدی کا اور ایک حصہ فصل کاٹنے اور پانی دینے والے کا ہوتا تھا جس کو زمین کھیتی باڑی کے لیے دی جاتی تھی۔ جن قیدیوں کو اوپن جیل میں منتقل کیا گیا ان سے قرآن پر حلف لینے کے باوجود ۱۸ قیدی جیل سے بھاگنے میں کامیاب ہوئے جن میں سے ۳ قیدی مسلمان نہیں تھے باقی تمام مسلمان تھے۔ پرویز مشرف کے دور میں قیدیوں میں ہونے والے اختلافات کے بعد اس جیل میں قیدیوں کو آزاد چھوڑنے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ اب کیونکہ یہ زمین خالی پڑی ہے اس لیے وہاں پر کچھ کام کرنے کے حوالے سے تجاویز دی جا رہی ہیں۔

اگر سندھ کی دیگر جیلوں اور قیدیوں کی سیکیورٹی کے حوالے سے بات کی جائے تو پاکستان میں دہشتگردی کی صورتحال کے پیشِ نظر متعدد جیلوں میں دہشتگرد قید ہیں۔ سزائے موت پر عائد پابندی کی وجہ سے خطرناک قیدیوں کو سزائیں نہیں دی جا رہی تھیں جس کی وجہ سے جیلوں کو سنگین خطرات کا سامنا تھا اس کے علاوہ جیلوں میں قیدیوں کی گنجائش سے زیادہ قیدی تھے۔ ایسی صورتحال میں جیل کے عملے کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا کیونکہ قیدیوں کی صحت اور ان کی سیکیورٹی کے انتظامات کرنا خاص طور پر اس صورت میں جب جیل میں زیادہ قیدی ہوں کافی مشکل ہو جاتا ہے۔ جیلوں کے افسران کو یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ بجلی جانے کی صورت میں فوراً جنریٹر چلا دیے جائیں تاکہ کسی بھی غیر یقینی سورتحال کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جیلوں کے بجٹ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے جیل پولیس افسر نے بتایا کہ جنریٹر کے استعمال پر بہت زیادہ خرچ آتا ہے۔ اول تو پورے ملک میں ہی بجلی کے بحران کو ختم کرنے کی ضرورت ہے لیکن جب تک ایسا ممکن نہیں تب تک کم سے کم تمام جیلوں کو ڈائریکٹ بجلی فراہم کی جائے تاکہ جنریٹر پر خرچ ہونے والے بجٹ کو جیل خانہ جات کی بہتری کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ گشت کے لیے مختص کی گئی رقم کے حوالے سے بتایا گیا کہ گشت کے لیے زیادہ رقم ڈسٹرکٹ پولیس کو درکار ہوتی ہے تاکہ وہ کمیونٹی پولیسنگ کر سکیں لیکن جیل کی گاڑیاں جیل کے دیواروں کے ساتھ ہی گشت کرتی ہیں اس لیے زیادہ بجٹ مختص نہیں کیا جاتا۔

جیل خانہ جات کے بجٹ پر نظر دوڑائیں تو ایک رپورٹ میں دیے گئے ۲۰۱۴ء-۲۰۱۳ء کے بجٹ کے مطابق سندھ میں موجود خواتین کی جیلوں میں سے اسپیشل جیل برائے ویمن حیدر آباد کا بجٹ ۱۲،۰۸۵،۰۰۰ روپے، اسپیشل جیل برائے ویمن کراچی کا بجٹ ۱۰،۹۰۱،۰۰۰ روپے، اور اسپیشل جیل برائے ویمن لاڑکانہ کا بجٹ ۱۸،۵۳۲،۰۰۰ روپے، سینٹرل جیل کراچی کا بجٹ ۲۰۶،۰۲۱،۰۰۰ روپے، سینٹرل جیل حیدر آباد کا بجٹ ۱۵۷،۳۳۹،۰۰۰ روپے، سینٹرل جیل سکھر۔ا کا بجٹ ۱۶۷،۴۷۷،۰۰۰ روپے، سینٹرل جیل سکھر۔ا۱ کا بجٹ ۴۰،۸۵۸،۰۰۰ روپے، سینٹرل جیل خیر پور کا بجٹ ۷۵،۷۸۴،۰۰۰ روپے، سینٹرل جیل لاڑکانہ کا بجٹ ۸۴،۵۷۶،۰۰۰ روپے مختص کیا گیا تھا۔ جیل خانہ جات کے پولیس افسر نے بتایا سپیشل الاؤنس کی مد میں جو رقم مقرر کی جاتی ہے اسکے بارے میں افسر جوابدہ نہیں ہوتا کہ وہ رقم اس نے کہاں خرچ کی ہے۔ جج بھی پولیس افسر سے یہ نہیں پوچھ سکتا کہ اس نے وہ رقم کہاں اور کیسے خرچ کی ہے، کیونکہ افسر کسی بھی کیس کے بارے میں کہہ سکتا ہے کہ فلاں کیس کی سپیشل تحقیق کے لیے رقم خرچ

کی جا چکی ہے جس کی رسید پیش نہیں کرنی پڑتی۔ قیدیوں کی صحت کے حوالے سے بتایا گیا کہ سندھ کی بڑی جیلوں میں علاج معالجے کی تمام سہولیات موجود ہیں، نیز ان کے پاس تمام تر جدید آلات موجود ہیں۔ قیدیوں کے لیے ڈاکٹروں کی ضرورت پیش آنے پر ڈسٹرکٹ پولیس سے خط لکھ کر ڈاکٹر طلب کیے جا سکتے ہیں۔ جیل کے پولیس افسر کا کہنا تھا کہ جیلوں میں بھیجے جانے والے قیدیوں کے ساتھ ان کی تمام ہیلتھ رپورٹ بھیجی جانی چاہییں کیونکہ جیل میں یہ سہولیات میسر نہیں ہوتیں بلکہ جب جیل میں کیمپ لگتے ہیں اور تمام قیدیوں کی سکریننگ ہوتی ہے اس کے بعد کئی نئے قیدی آتے ہیں جن کی صحت اور بیماریوں کے بارے میں معلومات نہ ہونے کی صورت میں دیگر قیدیوں کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔

سندھ میں خواتین کی جیلوں کے حوالے سے بات کرتے ہوئے جیل پولیس افسر نے بتایا کہ سندھ میں خواتین کی جیلوں کی انچارج خواتین پولیس افسران ہیں اور ان کی بھرتی جیل خانہ جات کی پولیس کے طور پر ہی کی جاتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ باقی پاکستان کی نسبت سندھ کی جیلوں کے حالات نسبتاً بہتر ہیں، ایک اہم سیاسی پارٹی کے لیڈر نے جیل سے نکلنے اور حکومت میں آنے کے بعد اس چیز کا نوٹس لیا تھا کہ سندھ میں قیدیوں کی خوراک کے لیے جو رقم مختص کی گئی ہے وہ ناکافی ہے اور اسکو غیر انسانی سلوک قرار دیتے ہوئے خوراک کی رقم بڑھائی جو کہ پہلے تقریباً ۳۵ روپے روزانہ تھی، اب تقریباً روزانہ کے حساب سے ۱۱۷ روپے ہو چکے ہیں۔ جبکہ آپ اور میں یہ بات اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کو جیلوں میں بھی تمام تر سہولیات فراہم کی جاتی ہیں لیکن پھر بھی ایسے اقدامات سراہے جانے کے قابل ہیں۔ مجھے اپنے بچپن کی چند باتیں یاد ہیں جب یہ سننے کو ملتا تھا کہ جب جیل میں آلو گوشت بنتا ہے تو اس کو "ڈیزل" کا نام دیا جاتا ہے اسکے پیچھے یہ وجوہات ہیں کہ وہ کھانے کے قابل نہیں ہوتا تھا اور اس کا رنگ بھی سیاہی مائل ہوتا تھا۔ لیکن جیل میں بننے والی دال کی تعریف کی جاتی تھی کہ وہ نہایت لذیز ہوتی ہے۔ میں جب قیدیوں کے ہاتھوں پاؤں اور گلے میں ڈالی گئی بیڑیوں کے ساتھ صفائی کرتے اور پودوں کو پانی دیتے دیکھتی تھی تو مجھے ترس آتا تھا۔ قیدیوں کے بارے میں مختلف باتیں سننے کے بعد میرے ذہن میں بہت سے سوالات آتے تھے جیسے کہ اگر کوئی قیدی اپنی قید کی مدت پوری کر لیتا ہے تو وہاں سے جانے کے بعد اس کا رویہ کیسا ہوتا ہے؟ لیکن اس سوال کے جوابات مجھے نہایت افسردہ کر دیتے تھے کیونکہ مجھے یہ ہی بتایا جاتا تھا کہ جیل سے جانے کے بعد بہت کم قیدی ایسے ہیں جو جرم سے توبہ کر لیتے ہیں، بلکہ جیل خانہ جات تو ان کے تربیتی سنٹر ہیں جہاں مختلف ملزمان ایک دوسرے سے مختلف حربے سیکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر ایک دفعہ کوئی مجرم چھوڑ دیا جاتا ہے اور دوبارہ اسی نوعیت کی کاروائی کہیں ہوتی ہے تو شک کی بنا پر اسی مجرم کو پکڑ کر پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ جیلوں میں قید مختلف قیدیوں کے پاس مختلف ہنر ہوتے ہیں جن سے وہ پیسے کما سکتے ہیں مثال کے طور پر پراندے بنانا، رِلیاں بنانا، قلم اور پنسلوں پر دھاگوں سے نام لکھنا وغیرہ۔

جیلوں میں موجود قیدیوں پر کوئی نا کوئی فردِ جرم عائد ہوتا ہے اور انہوں نے قانون کی خلاف ورزی کی ہوتی ہے اس لیے وہ اپنے جرم یا گناہ کی سزا بھگتنے کے لیے قید کیے جاتے ہیں۔ لیکن کیا مقرر کی گئی سزا کے بعد وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ قید سے آزاد ہونے کے بعد بہتر زندگی گزار سکیں؟ مجھے نہایت افسوس ہے کہ بجائے اس کے کہ قیدی جیلوں سے چھوٹنے کے بعد جرم سے توبہ کر لیں اور آئندہ ایسا کام نہ کریں، وہ بڑے پیمانے پر جرم کرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال سے بڑے قیدیوں کے لیے جیل خانہ جات اور لوگوں کو بھرتی کرنے کی جگہیں ہیں، جہاں پر ایک بڑے پیمانے پر جرم کرنے والے گینگ کا ممبر کسی چھوٹے مجرم کو اپنے گینگ کے لوگوں کے نمبر دے کر چھٹنے پر ان سے رابطہ کرنے اور ان کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ کر کے بھیجتا ہے۔ جیلوں میں ایسی تربیت دی جانی چاہیے کہ وہاں سے واپس آنے پر قیدی بہتر طور پر زندگی گزار سکیں اور جرم سے توبہ کر لیں۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

ڈیڑھ اینٹ کی مسجد

تحریر: ابتہاج شاہ

قومی لائحہ عمل پر عمل درآمد کرتے ہوئے تمام مدارس کو رجسٹر کرنے کے لیے کام جاری ہو چکا ہے اور اسی سلسلے میں بہت سے مدارس کو اس وقت تک کے لیے بند کر دیا گیا ہے جب تک وہ اپنی رجسٹریشن مکمل نہیں کر لیتے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب ہم سنا کرتے تھے کہ مدارس میں چھوٹے بچوں پر بہت ظلم ہوتا ہے ان کو مارا پیٹا جاتا ہے، لیکن جیسے جیسے میڈیا آزاد ہوا ہمیں یہ خبریں بھی ملنے لگیں کہ ظلم و ستم محض مدارس میں ہی نہیں بلکہ سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ اسکولوں میں بھی جاری ہے۔ وہ معصوم جو ظلم و ستم سہتے ہوئے، زمانے اور استاد کی مار کھا کر کچھ سیکھتے ہیں کیا ان کی معصومیت سفا کی میں بدل جاتی ہوگی؟ وہ خود پر کیے جانے والے ستم کا بدلہ دنیا کے جلادوں سے لینا چاہتے ہوں گے۔ اب ان کی نظر میں کون ظالم اور جلاد ہے یہ بھی ان کو دی جانے والی تعلیم پر منحصر ہے۔ وہ کیا سیکھ رہا ہے کس کے حق میں اسکو کچھ سکھایا جا رہا ہے اور کس کے خلاف بھڑکایا جا رہا ہے۔ جس طرح پاکستان میں تعلیمی اداروں کے مختلف معیارات ہیں سرکاری، نیم سرکاری، اور پرائیویٹ اسکولوں میں مختلف نظامِ تعلیم رائج ہے یہ ہی حال ہمارے دینی مدارس کا بھی ہے جو مختلف مسلک سے منسلک ہیں اور وہاں پر وہی تعلیم دی جاتی ہے جو کسی ایک خاص مسلک کی عکاسی کرتی ہے۔ کسی دوسرے مسلک کے لوگوں کو اچھوت سمجھا جاتا ہے۔ ہم اسلام کے نام پر کبھی اکٹھے نہیں ہوتے لیکن مسلک کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ جو فتنہ پھیلاتے ہیں اور آپس میں لڑاتے ہیں یہ کسی تیسری دنیا کے باسی نہیں بلکہ ہمارے ساتھ ہی بستے ہیں۔

پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مسلک کے نام پر مسجد رجسٹر کروانا ضروری ہے یہ ہی حال مدارس کا بھی ہے۔ یہ مسلک پرستی اور فرقہ واریت ہی ہے جو کہ بے پناہ گھر اجاڑ چکی ہے۔ یہ دہشتگردی ہزاروں گھروں کی بربادی کا سبب بنی، لیکن اب دہشتگردی کے خاتمے کے لیے نیشنل ایکشن پلان کو سامنے رکھتے ہوئے اقدامات اٹھائے جا رہے ہیں اسی زمرے میں دینی مدارس کی رجسٹریشن بھی کروائی جا رہی ہے۔ پاکستان میں مختلف مسالک کے مدارس ہزاروں کی تعداد میں ہیں ان کی درست تعداد جاننے اور ان کے کاموں پر نگاہ رکھنے کے لیے ان کی رجسٹریشن کروائی جا رہی ہے۔ یہ مدارس کئی سالوں سے کام کر رہے ہیں ان کی رجسٹریشن کروانا اور ان کے کام کرنے کی اجازت دینا کس کی ذمہ داری تھی؟ بغیر رجسٹریشن کے کوئی بھی ادارہ کیسے کام کر سکتا ہے؟ صرف دینی مدارس ہی نہیں بلکہ کوئی بھی ادارہ قانونی طور پر بغیر رجسٹریشن کے کام نہیں کر سکتا لیکن پاکستان میں بے شمار ایسے ادارے ہیں جو بغیر رجسٹریشن کے کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔

جو ادارے خصوصاً دینی مدارس رجسٹرڈ ہیں ان کی سرگرمیوں اور نصاب پر مکمل طور پر نگاہ نہیں رکھی جاتی، ایک بات تو صاف ظاہر ہے کہ کوئی بھی ادارہ، مدرسہ یا تنظیم کسی صورت بھی ایسی سرگرمیاں کھلے عام منعقد نہیں کروائے گی جن کا تعلق دہشتگردی سے ہو۔ یہ کام خفیہ اداروں کا ہے کہ وہ محض مدارس ہی نہیں بلکہ دیگر اسکولوں پر بھی نگاہ رکھیں۔ میرے خیال میں مدارس میں دہشتگردوں کی پرورش ہوتی ہے یہ تصور نہایت پرانا ہو چکا ہے جس میں اب سو فیصد حقیقت نہیں رہی۔ یہ نیا دور ہے، ٹیکنالوجی کا دور ہے، یاد رہے دہشتگرد تنظیمیں، اور دہشتگرد بہت منظم لوگ ہیں ان کے پاس ہر طرح کے ماہر افراد موجود ہیں، شاید ہمارے حکومتی اداروں کے پاس اتنے بہترین انفارمیشن ٹیکنالوجی ایکسپرٹ نہ ہوں جتنا کہ کسی کالعدم تنظیم کے پاس ہوں گے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ جہاں بھی کوئی دہشتگردی کی کاروائی ہوتی ہے اس سے ملنے والے سراغوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت سی پابندیوں کے توڑ نکال رکھے ہیں۔ جس کی ایک مثال ڈسٹرکٹ جیل کراچی کے سامنے جیل بریک کی کوششیں کرنے والے مجرمان کے پاس موجود ٹیکنالوجی ہے جہاں سے وہ زمین کھودتے تھے اور سرنگ بناتے رہے، اسکے علاوہ جیمرز لگے ہونے کے باوجود سٹیل کی پلیٹ کو دیوار کے ساتھ رکھ کر موبائل کے سگنل بحال کرنا جیسے کئی توڑ ہیں جو استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔

یہ کہنا بالکل بھی غلط نہ ہوگا کہ کالعدم ادارے ہم سے کئی سال آگے کی سوچتے ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ جب بھی حکومت کی جانب سے کوئی پابندی عائد کی جاتی ہے یا سرکاری اور غیر سرکاری ادارے مل کر غیر قانونی اداروں کے خلاف کاروائی کرنے لگتے ہیں دوسری جانب ان اداروں کی سرگرمیاں اور تیز کر دی جاتی ہیں۔ اب ایک مثال یہ ہی لے لیجئے جب بات کی گئی تمام مدارس کی رجسٹریشن کی تو ان اداروں کے کالم، اخبارات، میگزینز میں بھی ان ہی عنوانات پر ان کے نقطہ نظر دیکھائی دینے لگے، نیشنل ایکشن پلان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خواتین پولیس کمانڈوز کی فورس کی تربیت جس ٹریننگ اسکول میں ہو رہی ہے اس میں ہونے والے غیر اخلاقی سرگرمیوں کے حوالے سے خبر آئی تھی کہ ہمیں ان اداروں کے نقطہ نظر رکھنے والے لوگوں اور سوشل میڈیا پر ان کی سوچ دیکھائی دینے لگی جو کہ عورت کے گھر میں رہنے کی بات کر رہے تھے۔ لیکن اگر نگاہ دوڑائیں ان اداروں کی سرگرمیوں پر کہ ان اداروں میں خواتین کا کتنا اہم کردار ہے تو وہاں ہمیں خواتین کے لیے الگ میگزین بھی دیکھائی دیتے ہیں اور کانفرنس اور پیغامات بھی، یورپ سے خواتین داعش میں شمولیت کے لیے بھی نکلتی ہیں۔ ایسے موقع پر ان کے بھی دوہرے معیار سامنے آتے ہیں جہاں ان کے مفاد کی بات کی جا رہی ہوتی ہے۔

ہم شاید ایک صدی پیچھے چل رہے ہیں ہم وہ ہی پرانی اور دقیانوس سوچ لیے ہوئے ہیں کہ کسی بھی مدرسے میں پڑھنے والا ایک عام بچہ جس کو دنیا کے بارے میں کچھ سمجھ بوجھ نہیں ہے وہ ہی کسی کالعدم ادارے کے ہاتھوں استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن اب یہ نیا دور ہے بہت سی عسکریت پسند تنظیمیں ہیں جن کے اپنے اسکول سسٹم ہیں، اگر یہ تنظیمیں اتنے منظم طریقے سے اسکولوں کے جال بچھاتی رہیں تو ایک ایسی نسل پروان چڑھے گی جو جدید علوم اور دینی تعلیم میں تو ہم سے آگے ہوگی لیکن ان کو مختلف تنظیمیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کریں گی۔ کیا ایسے اسکولوں پر پابندی عائد نہیں کی جانی چاہیے جن کا تعلق کسی بھی کالعدم تنظیم سے ظاہر ہوتا ہو؟ یقیناً یہ حیران کن بات ہے ایک جانب غیر قانونی اداروں کی جانب سے اسکولوں اور کالجوں کو دھمکیاں دی جاتی ہیں، اسکولوں پر حملے کیے جاتے ہیں جن کی ذمہ داری غیر قانونی ادارے تسلیم بھی کر لیتے ہیں۔ دوسری جانب ایسے ادارے اسکول سسٹم کھولتے ہیں جنکا تعلق کالعدم اداروں سے ہے اور اس میں رائج نظامِ تعلیم میں دینی اور دنیاوی تعلیم دی جاتی ہے جس میں ماڈرن نظامِ تعلیم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نصاب ترتیب دیا جاتا ہے۔ اسکولوں میں کالعدم تنظیموں کی جانب سے سرگرمیاں منعقد کروائی جاتی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کالعدم ادارے اگر نوجوانوں کی تعلیم کے خلاف ہیں تو ان کے لیے سمر کیمپ، تقریری مقابلے، اور جسمانی کھیلوں کے مقابلوں کے ساتھ ساتھ تعلیم کے مواقع کیوں فراہم کرتے ہیں؟

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

ڈرامے اور پاکستانی تحاریر: پاکستان کی عکاسی یا کچھ اور؟

تحریر: الہام کاکڑ

ٹیلی ویژن کا ریموٹ میرے ہاتھ میں تھا اور میں چینل پر چینل تبدیل کیے جا رہی تھی۔ کوئی بھی ڈرامہ لگاتی تو وہاں روتی پیٹتی، زمانے کے ظلم وستم سے تنگ عورت دیکھائی جا رہی ہوتی۔ مجھے ان ڈراموں میں روتی عورتوں پر اختلاف تھا کیونکہ ایسا کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ایک عورت کو نہایت اطاعت گزار، فرمابردار، معاشرے کے ظلم سہتی، اپنے گھر والوں کے آگے خاموش ان کی ہر بات پر عمل کرتی ہے اور پھر بھی ناخوش اور روتے ہوئے زندگی گزار رہی ہو۔ کیا ہمارے ملک کی زیادہ تر عورتیں ایسی ہی زندگی گزار رہی ہیں؟ جن کی نمائندگی ان ڈراموں میں کی جا رہی ہے؟ پاکستان میں ہر طبقے کی خواتین موجود ہے۔ پاکستان میں صرف محترمہ بینظیر بھٹو اور شیری رحمان جیسی خواتین موجود نہیں ہے بلکہ ایسی خواتین بھی ہیں جن کے ہاتھ میں گھرانوں کی بھاگ دوڑ ہے۔ وہ خواتین بھی ہیں جو کے دفاتر میں کام کرتی نظر آتی ہے، ایسی خواتین بھی جو کہ دوسروں کے گھروں میں کام کرتی نظر آتی ہیں اور وہ بھی جو گھریلو خواتین ہیں۔ پاکستانی خواتین پر نظر دوڑاتے ہوئے اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان میں ۸۴ فیصد خواتین گھریلو تشدد کا شکار ہوتی ہے اور سال ۲۰۱۲ سے ۲۰۱۳ تک گھریلو تشدد کے ۴۸۱ کیس درج ہوئے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ہر طبقے سے وابستہ خواتین کی نمائندگی ٹیلی ویژن سکرین پر کیوں نہیں کی جاتی ہے؟

میڈیا میں خواتین کے حوالے سے پاکستانی ڈراموں میں کافی تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایک وہ دور تھا کہ ہمیں پاکستانی ڈراموں میں دوپٹہ اوڑھے خواتین دیکھنے کو ملتی تھیں اور ایک آج کا دور ہے جہاں پاکستانی ڈراموں میں خواتین کا لباس ہماری ثقافت کے برعکس ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ خواتین کو کس قسم کا لباس پہننا چاہیے لیکن میں صرف اس بات پر زور دینا چاہتی ہوں کہ میڈیا غیر ثقافتی چیزوں کو کیوں گلیمرائز کر رہا ہے؟ کیا تبدیلی محض خواتین کو گلیمرائز کرنے کا نام ہے؟ ہمارا میڈیا خواتین کو گلیمر کی طرف دھکیلنے کی بجائے ان کو رول ماڈل کے طور پر کیوں پیش نہیں کرتا؟ وہ پاکستان کا ہی میڈیا تھا جو خاتون کو ایک کامیاب پولیس افسر دکھاتا تھا جبکہ آج کے دور میں ہمیں اپنے ٹیلی ویژن سکرین پر ایسی خواتین دیکھنے کو نہیں ملتیں۔

ہمارے معاشرے میں ایسی بھی خواتین موجود ہیں جو اپنے گھرانوں کو بہت اچھے طریقے سے سنبھال رہی ہیں۔ آجکل جب ہم ڈراموں میں گھروں سے باہر کام کرتی خواتین کو دیکھتے ہیں تو یہ دکھایا جاتا ہے کہ وہ دفاتر کی بھاگ دوڑ میں اپنے گھر کو ترجیح نہیں دیتی اور دوسری جانب گھر بیٹھی خواتین کو روتا اور غمزدہ دکھایا جاتا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ یقیناً ان خواتین کی زندگی بہت متوازن ہے اور وہ اپنے گھریلو ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دیتی ہیں۔ ان خواتین کی نمائندگی ہمیں میڈیا میں کیوں نظر نہیں آتی؟ جب میڈیا پر تنقید کی جاتی ہے تو یہ سننے کو آتا ہے کہ ٹیلی ویژن سکرین پر وہی دکھایا جاتا ہے جو کہ ناظرین دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن کیا کسی نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ لوگ کیا دیکھنا چاہتے ہیں؟ کسی ڈرامے کو ریٹنگ میٹر کے ذریعے سے جانچنا کتنا قابل اعتماد ہے اس سے آپ اور میں باخوبی واقف ہیں۔

معاشرے کے دیگر مسائل کو پسِ پردہ ڈال دینا بھی بجا نہ ہوگا۔ میڈیا کا مقصد لوگوں کو آگاہی فراہم کرنا ہوتا ہے لیکن آگاہی کا عنصر بہت کم نظر آتا ہے۔ ڈراموں میں بھی سرمایہ کاری ہونے لگی ہے، کسی بھی ڈرامے یا پروگرام کے دوران اشتہارات کی بھرمار کر دی جاتی ہے، ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اشتہارات میں ڈرامہ بریک دینے کے لیے لگا دیا ہو۔ دن بھر کے کام کاج سے تھکی ہاری خواتین جب ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھتی ہیں تو معاشرتی مسائل کے موضوعات پر بنائے گئے ڈرامے دیکھنے کی بجائے اپنی روزمرہ کی زندگی سے کچھ ہٹ کر دیکھنا چاہتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسی زندگی کی خواہش کرنا، گلیمرزدہ خواتین کے نقشِ قدم پر چلنا ان کو کس دوراہے پر کھڑا کر سکتا ہے وہ نہیں

جانتیں۔اگر میں پاکستان کے ڈراموں کا موازنہ انڈیا کے ڈراموں سے کروں تو ایک واضح فرق دیکھائی دیتا ہے؟انڈیا اپنے مذہب،اپنے تہواروں اور اپنے کلچر کو فروغ دینے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتا۔اور ہمارے میڈیا کے لوگ تو معصوم ہیں کیونکہ وہ معصوم بچہ ہی تو ہوتا ہے جس کو انگارے کو پکڑنے سے منع کیا جائے پھر بھی وہ اس کی چمک دیکھ کر اسی کی جانب بڑھتا ہے۔

میرے خیال میں میڈیا کو معاشرے میں موجود خواتین کی مناسب عکاسی کرنی چاہیئے چونکہ میڈیا معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے اسی لئے میڈیا کو انہی پہلوؤں کی عکاسی کرنی چاہیے جو معاشرے میں موجود ہیں۔افسوس یہ ہے کے ہمارے معاشرے میں مختلف نقطہ نظر کی خواتین موجود ہیں جو مختلف میدانوں میں اپنے ہنر کے جھنڈے گاڑتی ہیں مگر بدقسمتی یہ ہے کے ان کی عکاسی ہوتے ہوئے نظر نہیں آتی۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

میں اور میرا آنے والا کل!

تحریر: جان محمد

بچپن میں بارہا دوہرایا جانے والا جملہ سنتے ہوئے میں بڑا ہوا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ اس ملک کا مستقبل ہیں۔ آنے والے وقتوں میں آپ نے ہی اس ملک کی باگ دوڑ سنبھالنی ہے۔ مجھے ہمیشہ سے اس بات سے تعجب ہوتا تھا۔ اور میں سوچتا تھا کہ ہم ہی کیوں؟ میں ہی کیوں؟ ہم میں آخر ایسا کیا ہے ہم تو نا تجربہ کار اور کم علم لوگ ہیں۔ ہم کیسے ان کی توقعات پر پورا اتریں گے۔ وقت گزرتا گیا، قانونِ فطرت مجھ پر آشکار ہونے لگی۔ مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ دنیا سے کوچ کر جانے والے اپنی آنے والی نسلوں کے لیے راہ ہموار کر کے جاتے ہیں۔ آنے والی نسلیں آگے بڑھتی جاتی ہیں اور یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ملک کی موجودہ صورتحال اور نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے میں جب سوچتا ہوں کہ میں اپنی آنے والی نسلوں کے لیے کیا چھوڑ کے جاؤں گا تو میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ کس طرح سے نوجوان ایسے معاشرے میں زندگی گزار سکتے ہیں جہاں کرپشن غیر سرکاری طور پر قانونی حیثیت اختیار کر چکی ہو؟ کیا وہ کبھی عورت کی عزت کرنا جان سکیں گے؟ کیا جب وہ پہلی بار بندوق کا استعمال کرنا سیکھ جائیں گے اس کے بعد وہ اس قابل ہوں گے کہ ایک دوسرے سے مذاق کر سکیں؟ وہ دوسرے مذاہب اور نسل کے لوگوں سے کیسے تعامل کریں گے؟ کیا وہ کبھی مل جل کر رہ سکیں گے؟ وہ ابھی تک لفظ امن کی حقیقت سے بھی واقف نہیں ہیں۔

اس اثناء میں میں ایک محاورہ تو بھول ہی گیا: جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں اس پر ہی انحصار کریں گی جو ہم ان کے لیے چھوڑ کر جائیں گے۔ ہم ان کے لیے کیا چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ کیا ہم ان کے لیے کرپشن، دوہرے معیارات، غیر مستحکم معاشرہ اور انتہا پسندی چھوڑ کے جائیں گے؟ وہ اپنے باپ دادا کی ریت نبھائیں گے جس میں قرض لینا، چوری کرنا، بھیک مانگنا، کسی کی بات سے اتفاق نہ کرنا، مرنا مارنا، دوہری شخصیت، دوسروں کو قصوروار ٹھہرانا اور یہ ہی سلسلہ چلتا چلا جائے گا۔ یہ انکا قصور نہیں بلکہ ہماری ذمہ داری ہے جس میں ہم ابھی تک ناکام ہیں۔

عام طور پر میرا ایسا ردِعمل ہوتا ہے، لیکن حال ہی میں نوجوانوں کے متعلق ایک سرگرمی میں حصہ لیتے ہوئے ایک جملے نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں چولستان جیپ ریلی ۲۰۱۵ء میں تھا۔ جو لوگ اس ریلی کے بارے میں نہیں جانتے ان کو بتانا چاہوں گا کہ اس ریلی میں ۲۰۰ کلومیٹر کے ٹریک پر جیپیں ریس لگاتی ہیں۔ پاکستان بھر سے اس ریلی میں جیپیں اور فورویل ڈرائیو گاڑیاں حصہ لیتی ہیں۔ پاکستان میں جیپ ریلی سالانہ منعقد کروائی جاتی ہے۔ میں اپنے ادارے کی جانب سے اس ریلی میں شرکت کر رہا تھا جسکا مقصد محض ریلی میں شرکت کرنا نہیں تھا بلکہ اس پلیٹ فارم کو دہشتگردی کے معصوم متاثرین کو خراجِ عقیدت پیش کرنا تھا۔ ہم نے اسکو امن کی ریلی کا نام دیا تھا۔ دہشتگردی سے متاثر ہونے والے معصوموں کی فہرست تو نہایت طویل ہے، ہم نے یہ ریلی خاص طور پر آرمی پبلک اسکول، ملالہ یوسفزئی اور احتزاز احسن کے نام کی تھی۔ ہم جیپ دوڑانے کے رسیاؤں کے پاس پہنچے، ان کی جیپوں پر ان ہیروز کے نام لکھوائے۔ نام لکھوانے کا مقصد یہ تھا کہ جب صحرا میں جیپیں دوڑیں گی تو لوگ ان پر تحریر کیے گئے نام پڑھیں گے۔ میڈیا ان پر رپورٹ کرے گا۔ ریلی میں شریک لوگ بھی وہ نام دیکھیں گے اور ان تک بھی پیغام پہنچے گا۔

بہاولپور کی جانب روانہ ہونے سے پہلے ہم نے لاہور میں نوجوانوں کے امور کے صوبائی وزیر کو دعوت دی کہ وہ آئیں اور ہماری سجی سنوری گاڑیوں کو لاہور سے جیپ ریلی میں جانے کے لیے رخصت کریں، اس ایونٹ میں نوجوانوں نے بھی شمولیت کی سبھی خوش نظر آ رہے تھے اور ہمیں اپنے کام پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔ ایک عام سرکاری دورے میں اعلیٰ حکام کے ریمارکس کے بعد جیپوں کو سب کے سامنے پیش کیا گیا۔ نوجوانوں اور وہاں پر موجود لوگوں نے آٹوگراف اور انٹرویو لیے وہ جاننے کی خواہش رکھتے تھے کہ

ہم کیا کر رہے ہیں۔ جیپوں کے ساتھ ایک سٹینڈی بھی تھی، جس پر ہم نے نوجوانوں کے ریمارکس لکھوائے تا کی یادگار رہے۔ کچھ نے لکھا امن چاہیے جنگ نہیں، کچھ کا کہنا تھا ہمیں امن چاہیے اسی طرح کے بے شمار احساسات کو قلمبند کیا گیا۔ میری ذمہ داری سٹینڈی پر تحریریں لکھوانے کی تھی اس لیے میں کچھ لکھ نہیں سکتا تھا ہاں لیکن میں ان کی تحریریں پڑھ رہا تھا۔ میں نوجوانوں کو ان کے خیالات کا اظہار کرتے دیکھ رہا تھا۔ میں یہ سرگرمی ہوتے دیکھ رہا تھا کہ اسی اثناء میں ایک نوجوان آیا اس نے مارکر اٹھایا اور سٹینڈی پر تحریر کرنا شروع کیا، میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ اس کی پیٹھ میری جانب تھی۔ اس نے لکھا کیا واقعی یہاں امن لکھنے سے ملک میں امن آ جائے گا؟ مجھے نہیں معلوم کہ وہ ہجوم میں کہاں کھو گیا تھا میں تو بس اس کی تحریر میں کھو چکا تھا۔

اس کی تحریر نے مجھے میرا محاصرہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مجھے اپنے قدم بھاری محسوس ہونے لگے تھے۔ اس لڑکے نے درست لکھا تھا! بالکل درست! ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔ کیا واقعی ہم آہنگی کو فروغ دینے اور انتہا پسندی کو ختم کرنے کے لیے ہم کچھ کر رہے ہیں۔ اس لڑکے نے حقیقت بیان کر دی۔ اتنے سالوں میں حکومت، میڈیا، سول سوسائٹی، اور نوجوانوں کی تنظیمیں کیا کر رہی ہیں؟ مجھے معلوم ہے کہ اگر میں یہ سوال سوشل میڈیا پر کروں گا تو مجھے بے شمار جوابات موصول ہوں گے جن میں بیان کیا جائے گا کہ بہت سی کتابیں لکھی گئیں ہیں، امن کے فروغ کے لیے آرٹیکلز لکھے گئے ہیں، دستاویزی فلمیں، حکومتی اور غیر سرکاری تنظیموں کے اقدامات کو اجاگر کیا جائے گا۔ لیکن کیا واقعی ہم جو چاہتے تھے ہم نے وہی پایا؟ کیا ہم نے معاشرے کا حق ادا کر دیا؟ کیا ہم ایک معاشرے کے طور پر واقف ہیں کہ امن ہے کیا؟ کیا میں ایماندار ہو سکتا ہوں، ابھی میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ مجھے ابھی ان سوالوں کے جواب دینے کے لیے ایک طویل سفر طے کرنا پڑے گا۔ یقیناً میں جہاں بھی جاؤں اور جو بھی کروں اس گمنام شخص کے الفاظ ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتے رہیں گے کہ کیا واقعی دیواروں پر لکھے الفاظ سے امن آ جائے گا؟

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

ملالہ سے نفرت اور عافیہ سے محبت کیوں؟

تحریر: حور کاکڑ

پاکستانی قوم ایسی قوم ہے جس کی ترجیحات یکسر الجھن کا شکار ہیں۔ بلاشعبہ ڈاکٹر عبدلقدیر خان ہمارا قومی وقار بلند کرنے کا ذریعہ ہیں، ان ہی کی بدولت پاکستان ایٹمی طاقت بنا، ہم اس بات کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ انہوں نے مبینہ طور پر ریاست کا راز فروخت کیا تھا۔ ہم ممتاز قادری پر تو پھول نچھاور کرتے ہیں لیکن سلمان تاثیر کے خلاف توہین رسالت کے قانون کو لاگو کرتے ہوئے اس پر تنقید کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام کے مقبرے سے مسلم کا لفظ مٹا دیا جاتا ہے پہلا مسلم نوبل انعام یافتہ لکھا ہونے کے بجائے اب وہاں پہلا نوبل انعام یافتہ لکھا رہ گیا ہے کیونکہ وہ احمدی تھے۔ ہمیں ملالہ یوسفزئی سے نفرت لیکن عافیہ صدیقی سے محبت ہے۔

ہماری ان الجھی ہوئی ترجیحات پر روشنی ڈالنے کا مقصد اس حقیقت کو اجاگر کرنا ہے کہ پاکستانی قوم مذہب کو انسانیت پر ترجیح دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے قومی ہیرو سے محبت اور نفرت کے پیچھے بھی ہماری اولین ترجیح مذہب ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو ہمارے وطن کی بنیاد ہی مذہب کی بنا پر رکھی گئی ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ ہم نے قائدِ اعظم کے الفاظ مذہبی آزادی کا غلط مطلب اخذ کیا، درحقیقت تو انسانیت ہی ایک مذہب ہے۔ ہم اپنی رائے کی بجائے سیاسی راہنماؤں کی پیش کردہ ہمدردانہ تصور پر یقین کر لیتے ہیں۔

اب میں آپکی توجہ اپنے آرٹیکل کے عنوان کی جانب دلوانا چاہوں گی ہم ملالہ یوسفزئی سے نفرت لیکن عافیہ صدیقی سے محبت کیوں کرتے ہیں؟ مجھے افسوس ہے کہ ہماری قوم سازشی نظریات پیش کرنے میں ماہر ہے! چند لوگ ان سازشات کو رد کر کے عقلی دلائل پیش کرتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جو آنکھیں بند کر کے سازشوں پر یقین کر لیتے ہیں اور اسکو بنیاد بنا کر سولہ سالہ بچی سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ پھر ہمیں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو ان نظریات کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں جبکہ کچھ لوگ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔

سچ بتائیں! جب بھی آپ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا نام سنتے ہیں تو آپکے ذہن میں کیا آتا ہے؟ کیا آپکو مظلومیت کا احساس نہیں ہوتا؟ اور جہاد کا عنصر زیادہ جنون دلاتا ہے۔ ہمیں عافیہ سے کیونکر محبت نہیں ہوگی؟ وہ ہمارے لیے ایک مثالی نمونہ ہے! ہمارے سب سے بڑے دشمن امریکہ نے ڈاکٹر عافیہ کو دہشتگردی کے الزام میں قید کر رکھا ہے۔ آخر کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ مسلمان ہے؟ ہمارے قوم کی بیٹی مغرب میں قید ہے اور ہم ایک سولہ سالہ بچی کی تعلیم کے لیے طالبان سے جنگ کر رہے ہیں، ہمیں شرم آنی چاہیے!

مجھے اعتراض اس بات کا نہیں کہ ہم عافیہ کو ملالہ پر ترجیح کیوں دیتے ہیں بلکہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ہم عافیہ اور مالہ کا موازنہ کیوں کرتے ہیں؟ پاکستان کی اکثریت مسلمان ہے تو ہم ایک ایسے مسلمان پر تشدد کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں جو بیرونِ ملک قید ہے۔ کیا کبھی ہم نے یہ سوچا ہے کہ اس نے پاکستان کے لیے کیا کیا ہے؟ نہیں! تو پھر ہم اس کے خلاف ثبوت اور شواہد کو کیوں نظرانداز کر دیتے ہیں؟ عافیہ کی اتنی حمایت کیوں؟ ہم عافیہ کو قوم کی بیٹی کہتے ہیں لیکن ملالہ کو نوبل امن انعام ملنے پر تنقید کرتے ہیں۔

ہم ثبوت کو نظرانداز کر دیتے ہیں اور عافیہ کے لیے ریلیاں نکالتے ہیں، لیکن ملالہ پر یہودی ایجنٹ ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ کچھ لوگ ملالہ پر الزام لگا کر کامیاب ہو گئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ لوگ سولہ سالہ بچی پر الزام لگا کر کیسے کامیاب ہو گئے۔ شاید اس لیے کیونکہ اس بچی کا یہ کہنا تھا کہ اوباما اس کے لیے ایک مثال ہے جبکہ ہم سب کا یہ ماننا

ہے کہ اوباما کے پاکستان کے خلاف منصوبے ہیں اور اس بچی نے اسکو اپنے لیے مثالی شخصیت بنالیا۔ ہم اس کام کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو کام ملالہ نے پاکستان کی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کیے اور محض ایک بات کی بنیاد پر اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

ملالہ وہ بچی جس کو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اقدامات اٹھانے پر نوبل پیس انعام سے نوازا گیا۔ اس نے لڑکیوں کی تعلیم کی حق میں طالبان کے خلاف آواز بلند کی، جو کہ آسان کام نہیں تھا۔ اس نے تعلیم کے لیے موقف پر ڈٹے رہنے کے ناکردہ جرم میں سر پر گولی کھائی اور بین الاقوامی سطح پر کامیاب ہوئی۔ کیا وہ اس شہرت سے خوش ہے؟ نہیں! ملالہ کے والد کے مطابق وہ اپنی اس شہرت پر خوش نہیں ہے لیکن وہ لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے کیے جانے والے اقدامات کے لیے اپنی شہرت کو استعمال کر رہی ہے۔ ملالہ کو توجہ دی جارہی ہے اس لیے ہمیں ملالہ سے نفرت ہے۔

جب بھی ملالہ کی بات آتی ہے تو بہت سے سوالات اٹھتے ہیں کہ ملالہ ہی کیوں؟ اس کے ساتھ وین میں موجود دوسری بچیاں کیوں نہیں؟ ڈرون سے متاثر ہونے والے بچے کیوں نہیں؟ ملالہ ہی کیوں؟ عافیہ کیوں نہیں؟ یہ سب سوال اس لیے اٹھتے ہیں کیونکہ ہمیں ملالہ سے نفرت ہے۔ لیکن ملالہ سے نفرت کیوں؟ اس کیوں کا جواب میرے پاس نہیں! شاید ملالہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے لہجوں میں امنڈ آنے والی کڑواہٹ اس کی شہرت سے حسد کا نتیجہ ہے۔ لیکن گولی لگنے کے بعد شہرت پانے والی بچی سے حسد کیوں؟ اسکے قصوروار وہ لوگ ہیں جو ملالہ کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ ملالہ کے ساتھ عافیہ کا موازنہ کرنا مضحکہ خیز ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس بات کو ختم نہیں ہونے دیتے کیونکہ ان کو ملالہ سے نفرت ہے اور وہ ملالہ کو مثالی لڑکی کے طور پر کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

دیر سے آئے پر کیا درست آئے جناب؟

تحریر: ابتہاج شاہ

پاکستان گزشتہ ایک دہائی سے دہشتگردی کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے لیکن دہشتگردی سے نمٹنے کے لیے کوئی پالیسی سرے سے بنی ہی نہیں تھی کہ جس پر عمل کر کے پاکستان کو دہشتگردی کی لعنت سے چھٹکارا دلایا جا سکتا۔ لیکن پھر آرمی پبلک اسکول پشاور کے سانحے نے پورے پاکستان کو ہلا کر رکھ دیا، پاکستان کی موجودہ حکومت نے بھی اس واقعے اور دہشتگردی کی کاروائیوں کا سختی سے نوٹس لیا۔ اسی سلسلے میں ایک قومی لائحہ عمل مرتب کیا گیا جو کہ پاکستان کی حکومت اور پاکستان فوج کی جانب سے دہشتگردی کے خلاف کاروائی شروع کرنے کا ایک قانونی لائحہ عمل ہے۔ یہ قومی لائحہ عمل بیس نکات پر مشتمل ہے جو کہ اکیسویں ترمیم کے تحت پاکستان کے آئین میں قانونی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

قومی لائحہ عمل کے اہم نکات یہ ہیں

۔مسلح افواج کے سربراہان کی نگرانی میں دہشتگردی کے مقدمات کی سماعت کے لیے فوجی عدالتیں قائم کرنا

۔سزائے موت پر عائد پابندی ختم کرنا

۔دہشتگردوں کو فنڈ بھیجنے والے ذرائع بند کرنا

۔کالعدم تنظیموں کو نام تبدیل کر کے بھی سرگرمیاں جاری نہیں رکھنے دی جائیں گی

۔انسداد دہشتگردی کے خاتمے کے لیے خصوصی فورس تشکیل دی جائے گی

۔دینی مدارس کی رجسٹریشن کے لیے نظام تشکیل دیا جائے گا اور دہشتگردوں کو فنڈ فراہم کرنے والے وسائل منجمد کیے جائیں گے

۔میڈیا پر دہشتگردوں کی کاروائیوں کو ختم کیا جائے گا اور میڈیا کا مکمل مشاہدہ کیا جائے گا

۔دہشتگرد تنظیموں کے بات چیت کے نظام کو ختم کیا جائے گا

۔ادبی مواد اور پراپیگنڈا کے ذریعے فرقہ واریت، انتہاپسندی اور عدم رواداری کو پھلانے کی اجازت نہیں دی جائے گی، جو اخبارات اس کام میں ملوث ہیں ان کے خلاف باقاعدہ کاروائی کی جائے گی

۔افغان مہاجرین کی وطن واپسی کے لیے پلان بنایا جائے گا

۔عدالتوں کے قیام کے لیے ضروری آئینی اور قانونی ترامیم کی جائیں گی

۔فرقہ واریت پھیلانے والے دہشتگردوں سے سختی سے نمٹا جائے گا

۔نیشنل کاؤنٹر ٹیررازم اتھارٹی کو فعال اور موثر بنایا جائے گا

۔پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو دہشتگردوں کے نظریات کی تشہیر کی اجازت نہیں دی جائے گی

۔کراچی میں دہشتگردی کے خلاف جاری آپریشن کو منطقی انجام تک پہنچایا جائے گا

۔سیاسی اقدامات کے تحت، تمام اسٹیک ہولڈرز مل کر بلوچستان کی حکومت کو بااختیار بنائیں گے

۔افغان مہاجرین کے لیے ایک جامع پالیسی مرتب کی جائے گی

۔ شمالی وزیرستان کے بے گھر افراد کی بحالی اور واپسی کے لیے اقدامات کیے جائیں گے، فاٹا میں انتظامی اصلاحات اور ترقیاتی سرگرمیوں کو تیز کیا جائے گا

قومی لائحہ عمل پر عمل درآمد ہونا شروع ہو گیا اور اسی سلسلے میں دہشتگردوں اور مشتبہ افراد کی گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں، دہشتگردوں کو پھانسیاں دی گئیں اور کالعدم تنظیموں کے سماجی اداروں اور منی ایکسچینج کو بھی کالعدم قرار دے دیا گیا، سزائے موت پر عائد پابندی ختم کر دی گئی، دہشتگردی کے خاتمے کے لیے فورس تیار کی جانے لگی اور دیگر پلان جو قومی لائحہ عمل کا حصہ ہیں ان پر عمل درآمد ہونے کی خبریں آنے لگیں۔ اس پر کتنا عملدرآمد ہو رہا ہے اس کے بارے میں ہمیں میڈیا تو آگاہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن صورتحال یہ ہے کہ پاکستان میں بے شمار کالعدم تنظیمیں کام کر رہی ہیں، کبھی نام تبدیل کر کے اور کبھی مختلف اداروں کے نام سے کام کیا جا رہا ہے جو بظاہر سماجی کاموں میں ملوث ہیں لیکن ان کا تعلق کالعدم تنظیموں سے ہے حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کالعدم ہونے کے باوجود ان کا کام جاری رہتا ہے۔ سانحہ پشاور کے بعد ان تنظیموں کے نئے ناموں اور ان کی فلاحی تنظیموں کو بھی کالعدم قرار دے دیا گیا۔ یاد رہے کہ کسی بھی ادارے کو اس وقت کالعدم قرار دیا جاتا ہے جب کوئی بھی ادارہ یا تنظیم ملکی سالمیت کے خلاف سرگرم ہوتی ہے، لیکن اگر پھر بھی وہ تنظیم اپنی سرگرمیاں جاری رکھے تو قصوروار کون ہے؟ قانون نافذ کرنے والے ادارے، حکومت یا ایجنسیاں جن کی ناک کے نیچے یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے ۔ میں آپکے سامنے ایک کالعدم ادارے کی سرگرمیوں کی مثال رکھنا چاہوں گی۔

کالعدم قرار دیے جانے کے باوجود راولپنڈی کے اہم علاقوں میں بل بورڈ پر کالعدم تنظیم یومِ کشمیر کے موقع پر اپنے اشتہار آویزاں کرواتی ہے۔ یہ ایک الگ سوال ہے کہ وہ بل بورڈ کس کمپنی کی ملکیت ہیں؟ ہاں لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وزیرِ اعظم نواز شریف کے اس بیان کے باوجود کہ " کالعدم تنظیمیں اب حقیقی معنوں میں خود کو کالعدم سمجھیں" کالعدم تنظیمیں بہت بڑے پیمانے پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں اور سرِ عام اپنے ادارے کے نام کے ساتھ اشتہارات آویزاں کرتی دیکھائی دیتی ہیں۔ تعجب محض اس بات پر نہیں بلکہ حیرت کی بات تو یہ بھی ہے کہ اسلام آباد کے ایک نہایت پر آسائش علاقے میں جہاں کالعدم ادارے کی صرف مسجد تھی اب وہاں ہمیں ان کے اسکول، لائبریری اور ان کے اشاعت گھر کا نام واضح نظر آتا ہے۔ کیا یہ قانون نافذ کرنے والے اداروں سے ڈھکی چھپی باتیں ہیں؟ کیا ادارے اور حکومت اس بات سے بے خبر ہیں کہ یہ ادارے کس طرح کام کر رہے ہیں؟ جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ کالعدم تنظیموں کو کام کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پہلے یہ تنظیمیں اجازت سے کام کر رہی تھیں؟ سیاسی لیڈروں کے بیانات جن میں چوہدری نثار صاحب فرماتے ہیں " کئی کالعدم تنظیمیں نام بدل کر پاکستان میں فعال ہیں"، اور ایک اور بیان کے مطابق " پنجاب میں ۹۵ کالعدم تنظیمیں متحرک ہیں"۔ غیر قانونی قرار دیے جانے کے بعد تو ان اداروں کے کام مزید وسیع پیمانے پر ہوتے دیکھائی دینے لگے ہیں۔ دہشتگردی کے خاتمے کے لیے فوجی عدالتوں کے قیام کی منظوری دی جا رہی ہے، کیا عام عدالتوں کو وہ اختیارات نہیں دیے جا سکتے؟ کیا عدالتوں میں بیٹھے ہوئے قانون کے رکھوالے اس قابل نہیں ہیں کہ ان کے کندھوں پر یہ ذمہ داری ڈالی جائے کہ وہ سخت سزائیں دیں اور انصاف فراہم کر سکیں؟

دہشتگردوں کو مالی مدد فراہم کرنے اور فنڈ مہیا کرنے والے ادارے تو کالعدم قرار دے دیئے گئے ہیں لیکن یہ تنظیمیں ٹرسٹ، فلاحی تنظیموں، اسکولوں وغیرہ کے کاروبار سے جو کما رہی ہیں اس پیسے پر اور ان کی سرگرمیوں پر کون نظر رکھے گا؟ پھر یہ ہی نہیں بلکہ یہ ادارے سرِ عام حکومتی اقدامات پر اپنے میگزین، رسائل اور کتابوں میں اپنا نظریہ پیش کرتے دیکھائی دیتے ہیں۔ کمیونیکیشن کے نظام کو ختم کیے جانے کی بھی ایک شک اس ایکشن پلان کا حصہ ہے لیکن مجھے تو آرمی پبلک اسکول پر بننے والی ایک ویڈیو اور ترانے کے جواب میں ترانے اور نظمیں منظر عام پر نظر آنے لگی ہیں۔ رہی بات میڈیا کی تو میڈیا کو ان غیر قانونی اداروں کے حوالے سے خبریں شائع نہ کرنے دی جائیں کیونکہ میڈیا گھروں کو اور صحافیوں کو تحفظ کون فراہم کرے گا؟ میڈیا کے ادارے جن کو ایک لفافہ وصول ہوتا ہے جس میں کالعدم اداروں کی جانب سے خبر اور تصاویر موجود ہوتیں ہیں۔ میڈیا کو وہ خبر بغیر ایڈیٹ کیے اور تصاویر سمیت چھاپنے کا کہا جاتا ہے اور دھمکیاں دی جاتی ہیں ان کو تحفظ کون فراہم کرے گا؟ کیا وہ ادارے تحفظ فراہم کرنے کے قابل ہیں جن میں بھرتیاں تو ملک و قوم کی حفاظت کے لیے کی جاتی ہیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ذمہ دار محض چند لوگوں کی خصوصی حفاظت کے لئے ہوتے ہیں؟ یہ وہ خصوصی لوگ ہیں جن کے ہاتھ میں ان کی لگام ہوتی ہے، جی ہاں! ہمارے سیاسی لیڈر جو کہ اپنی سیکیورٹی کے لیے ایک بھاری نفری کو ساتھ لیے بغیر دو قدم نہیں چل سکتے۔ ایک اور شک میں افغان مہاجرین کی وطن واپسی کی بات کی گئی ہے تو میرے خیال سے پاکستان میں محض افغان مہاجرین پر ہی نہیں بلکہ مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دیگر ممالک سے آنے

والے طلبہ پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے۔

دہشتگردی میں ملوث ہونے والے افراد کو لوگوں کے لیے عبرت کا نشان بنانا چاہیے۔ ان کو کچہریوں اور جیلوں میں سزا کاٹنے اور بھگتنے کے لیے چھوڑا جائے گا تو یہ نا صرف ہمارے معاشرے کی بقاء بلکہ ہمارے ملک کی سالمیت کے لیے خطرہ ہے، دہشتگردوں کو موقع پر اور سب کے سامنے سزا دی جائے۔ قومی لائحہ عمل پر سختی سے عملدرآمد کرنے کی ضرورت ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ قومی لائحہ عمل جس کو انگریزی میں نیشنل ایکشن پلان کہتے ہیں اور اس کا مخفف انگریزی میں این۔اے۔پی (NAP) بنتا ہے، واقعی نیپ کے طور پر ایک لطیفہ بن کر رہ جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم حکومت اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے نیپ سے جاگنے کا انتظار کرتے رہ جائیں اور خواب خرگوش کے مزے لوٹتے لوٹتے ملک لٹوا بیٹھیں۔ جب سے قومی لائحہ عمل پر عملدرآمد کی بات کی جارہی ہے تب سے سبھی اسی انتظار میں ہیں کہ جلد از جلد دہشتگردی کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ دہشتگردی پاکستان کو کینسر سے بھی زیادہ مہلک مرض کی طرح اپنے شکنجے میں لیئے ہوئے ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے لیکن اگر دہشتگردی کے گڑھ کو ختم نہ کیا گیا اور اس کو جڑ سے نکال کر نہ پھینکا گیا تو یہ ملک کی سلامتی کے لیے خطرہ ہوگا۔ قومی لائحہ عمل پر عمل شروع ہونے کے بعد دہشتگردی کے بے شمار واقعات ہمارے سامنے آئے ہیں، کبھی کہا جاتا ہے کہ دہشتگردوں کے حوصلے پست ہو چکے ہیں اور اس لیے وہ زیادہ حملے کر رہے ہیں مجھے تو یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ اگر پست حوصلہ لوگ اتنے بڑے پیمانے پر تباہی کر سکتے ہیں تو کیا وہ ادارے جو ملک و قوم کی سلامتی اور ملک میں امن قائم رکھنے کے ذمہ دار ہیں وہ حوصلے بلند رکھتے ہوئے بھی ان کو روکنے میں کیسے ناکام ہو جاتے ہیں؟

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

عدالت کی تاریخ: فوج سے مانگو!

تحریر: حور کاکڑ

سانحہ پشاور کا ہمارا اجتماعی ردعمل دہشتگردوں سے غیر ہمدردانہ انتقام لینا ہے۔ تمام لوگ معصوم جانوں کے دشمنوں سے بدلے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ دل دھلا دینے والا واقعہ اتنا بڑا تھا کہ ہم اپنے ہوش گوا بیٹھے ہیں اور اب ہم دہشتگردوں کو سرعام پھانسی دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لوگوں کا ایسی سخت سزا کا مطالبہ فطری ہے مگر افسوس یہ مطالبہ کوئی بصیرت نہیں رکھتا۔ ہم ان دہشتگردوں سے بدلہ لینے کا مطالبہ ایسے ہی کر رہے ہیں جس طرح وہ ہمارے خون کا مطالبہ کر رہے ہیں! ان حالات میں مناسب حکمتِ عملی نہیں اپنائی جا رہی اور نہ ہی میانہ روی سے فیصلے کیے جا رہے ہیں۔

سانحہ پشاور نے یقینی طور پر پوری قوم کو متحد کر دیا۔ ہمارے سیاسی رہنماؤں نے بھی اپنے سیاسی اختلافات بھلا کر آپس میں اتحاد اختیار کر لیا ہے۔ اس سانحے نے پوری قوم کو ہلا دیا۔ اس کے بعد ہونے والے آل پاکستان کانفرنس میں وزیراعظم نے عہد لیا کہ ان معصوم بچوں کے خون کا انتقام لیا جائے گا۔ اس کانفرنس میں انہوں نے دہشتگردی سے نمٹنے کے لئے بیس نکات پر مشتمل قومی لائحہ عمل پر روشنی ڈالی۔ اس پلان کا تجزیہ فوج کو بااختیار بنانے کی عکاسی کرتا ہے اور قیادت کی نااہلی کو ظاہر کرتا ہے جو خود ان حالات سے نہیں نمٹ سکتے۔

قومی لائحہ عمل کے تحت حکومت نے فوجی عدالتوں کے قیام کا اعلان کیا جن میں دہشتگردوں کے مقدمات کی سماعت ہوگی۔ اکیسویں آئینی ترمیمی بل ۲۰۱۵ء کی منظوری کے ساتھ ان خصوصی عدالتوں کو دو سال کی مدت کے لئے قائم کیا جائے گا۔ یہ ایک امید افزا لائحہ عمل نظر آ رہا ہے مگر اس پر غور کرنے کے بعد بہت سے سوالات اٹھتے ہیں، جیسا کہ فوجی عدالتیں دہشتگردی کا حل ہیں؟ کیا ہماری عدلیہ اتنی نااہل ہے کہ وہ خود مجرموں کو سزا نہیں دے سکتی؟ فوج کو عدالتی کارروائیوں میں کیوں شامل کیا جا رہا ہے جبکہ وہ پہلے سے قبائلی علاقوں میں جاری کارروائیوں میں ملوث ہیں؟ کیا فوجی عدالتوں کا قیام فوج کی کارکردگی کو متاثر نہیں کرے گا؟ کیا فوجی عدالتوں کا قیام اس بات کی نشاندہی نہیں کرتا کہ پاکستان میں کون اقتدار میں ہے، فوج یا جمہوریت؟

فوجی عدالتوں کا قیام موجودہ آئینی جمہوریت کو ختم کر کے فوجی اقتدار کے لیے راہ ہموار کرے گا کیونکہ فوجی عدالتیں جمہوری حکومت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں۔ یہ پالیسی پاکستان کو ایک عسکری قیادت بنا دے گی۔ سچ یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں جب بھی فوجی اقتدار آیا ہے اس کا نتیجہ ہمیشہ برا ہی رہا ہے۔ کیونکہ مناسب حکمتِ عملی اختیار نہیں کی جاتی رہی جس سے مسائل حل ہونے کی بجائے مزید پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ فوجی عدالتیں یقینی طور پر دہشتگردی کا حتمی حل نہیں ہیں۔ کیا یہ فوجی انقلاب کے لئے جمہوریت کا نیا دعوت نامہ نہیں ہوگا؟

سانحہ پشاور کے لئے ہمارا ردعمل بالکل ویسا ہی ہے جو کہ امریکہ کا ۹/۱۱ کے لئے تھا۔ امریکہ نے ۹/۱۱ کے بعد ملزمان کو منصفانہ مقدمات کے سماعت سے انکار کر کے قانون توڑا تھا۔ پاکستان میں بھی عام شہریوں کے خلاف درج مقدمات کی فوجی عدالتوں میں سماعت کے لیے قانون کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔ کیا ہم گوانتاناموبے کے بعد کی ہولناک صورتحال بھول گئے ہیں کہ اب ہم بھی اسی راستے پر جا رہے ہیں؟ عام شہریوں کے مقدمات کی سماعت فوجی عدالتوں میں کرنے سے ان کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ ہم بحالی اور تعمیر و امن کا ایک موقع دینے کے لئے آواز اٹھا سکتے ہیں مگر حالات کچھ ایسے انتہا پسند ہو گئے ہیں کہ ایسا کرنے سے ہم دہشتگردوں کے ہمدرد کہلائے جائیں گے۔

عدالتوں کوفوج کے حوالے کرنے سے ہماری عدلیہ کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ بجائے اس کے کہ حکومت عدلیہ کی انتظامیہ اور حالات پر غور کرے، اس نے دہشتگردی کی لعنت سے نمٹنے کی پوری ذمہ داری فوج کے حوالے کرنے کا منصوبہ بنا دیا ہے۔ ہماری عدلیہ کمزور ہے اور ہمارے قانون نافذ کرنے والے اداروں میں موثر انداز میں دہشتگردی سے نمٹنے کی صلاحیت کم ہے۔ یہ ہمارے عدلیہ کے نظام کی ناکامی کی عکاسی کرتا ہے اور اب ہم دہشتگردوں کے مقدمات کی سماعت کے لئے فوج پر انحصار کر رہے ہیں۔

پاکستان میں مجرموں کو سزا دینے کا رواج نہیں ہے۔ اس کی وجہ نا صرف غیر موثر تحقیقاتی اقدامات ہیں بلکہ جب دہشتگردی کی بات آتی ہے تو وکلاء، ججوں اور دہشتگردی کے خلاف کام کرنے والے اداروں کے گواہوں کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۱۳ میں صوبہ پنجاب میں سزا ہونے کی شرح صرف ۱۳ فیصد ہے۔ اس رپورٹ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ منحرف تحقیقات اور استغاثہ کی وجہ سے قیدیوں کی رہائی کی شرح زیادہ ہے۔ مختلف تنظیموں کے درمیان شفافیت اور تعاون کی کمی بھی کم سزاؤں کی شرح میں سے ایک ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ سانحہ پشاور نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا ہے، جس کے نتیجے میں حکومت کی جانب سے فوری ردعمل طلب کرنا مناسب لگ رہا ہے۔ لیکن ہم یہ کیسے بھول سکتے ہیں کہ یہ پاکستان کی سرزمین پر پہلا بڑا دہشتگردی کا سانحہ نہیں ہے۔ پاکستان جمہوریت اور آمریت دونوں ادوار میں عسکریت پسندی اور فرقہ وارانہ تشدد سے نبرد آزما ہوتا آیا ہے۔ اس بات کا احساس پہلے کیوں نہیں ہوا کہ ملک کو سنگین خطرات کا سامنا ہے؟ ان خطرات سے نمٹنے کے لئے مناسب اصلاحات کے برعکس ہم فوجی عدالتوں کے مطالبے کی تائید کر رہے ہیں۔ فوجی عدالتوں کا قیام نا صرف ہمارے قانونی نظام کو دہشتگردی کے مقدمات میں ناکامی کو ظاہر کر رہا ہے بلکہ موجودہ سکیورٹی اہلکاروں کی قابل اعتماد تفتیش کی صلاحیت پر ایک سوالیہ نشان ہے۔

متوازی عدلیہ کے نقطہ کو سامنے رکھتے ہوئے بار ایسوسی ایشن نے قانونی بنیاد کے اوپر اکیسویں آئینی ترمیم کی مخالفت کی ہے۔ اگر موجودہ شرعی عدالتوں اور انسداد دہشتگردی کے عدالتوں کے باوجود بھی سزاؤں کی شرح بہت کم ہے تو یقیناً اس صورتحال کا حل متوازی عدلیہ نہیں ہے۔ اگر پاکستان میں انسداد دہشتگردی کی عدالتیں قائم ہیں تو پھر ہم کیوں دہشتگردی سے نمٹنے کے لئے فوجی عدالتوں کا رُخ کر رہے ہیں؟ اس کے علاوہ اس کا اشارہ اس طرف ہے کہ عسکریت پسندوں کو سزائے موت ان کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ لیکن حکومت نے دہشتگردوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے ۵۰،۰۰۰ شہریوں کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کی بنیاد پر اپنے موقف کو جائز قرار دیدیا۔

ایک جانب لوگ فوجی عدالتوں کے قیام کی مخالفت کر رہے ہیں اور دوسری طرف اس کو دہشتگردوں کے خلاف بہترین انتقام سمجھتے ہوئے اس کو سراہا جا رہا ہے۔ فوجی عدالتوں کا قیام نا صرف عدلیہ کی ناکامی اور فوج کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہے بلکہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ اکیسویں آئینی ترمیم کا دورانیہ دو سال کا ہے۔ فوجی عدالتوں کے حامیوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عوام اس دو سالہ دورانیے میں جمہوری نظام پر سمجھوتا کئے بغیر فوری انصاف طلب کرنے کی خواہشمند ہے۔ دہشتگردی کے خاتمے کے لئے جو عوام فوجی عدالتوں کی حمایت کر رہی ہے کیا وہ یہ بھول رہے ہیں کہ پاکستان پہلی مرتبہ دہشتگردی کا شکار نہیں ہوا؟ جمہوریت اور آمریت کے تعلقات کی تلخ مثالیں پاکستان کی تاریخ میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ تاریخ پر نظر دوڑاتے ہوئے ہم کیسے بھول سکتے ہے کہ ۱۹۷۷ اور ۱۹۹۹ میں بھی فوجی عدالتوں کے قیام کے نتیجے میں جمہوریت کے تخت کو الٹ کر مارشل لاء نافذ کیا گیا تھا۔ مشکل اوقات میں امن کے قیام کے لئے ایسے انتہائی اقدامات اٹھانا وقت کی ضرورت ہے لیکن ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ پاکستان کی تاریخ میں ان اقدامات کے ذریعے آمریت کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ موجودہ وقت کی مناسبت کے ساتھ فوجی عدالتوں کا قیام اس مسئلہ کا حل دکھائی دے رہا ہے لیکن اس کے نتیجے میں آنے والے طوفان کے لئے بھی تیار رہنے کی ضرورت ہے۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

پاکستان کا بادشاہ کون؟

تحریر: سندس سیدہ

آپ.....

جی ہاں!

آپ ہی پاکستان کے بادشاہ ہیں!

آپ سوچ رہے ہوں گے یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ کے پاس کیا اختیارات ہیں؟ آپ تو اپنے مسائل خود حل نہیں کر سکتے تو پاکستان کے بادشاہ کیسے ہو سکتے ہیں؟ لیکن یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے بادشاہ آپ ہی ہیں۔ کیونکہ پاکستان کے ۱۹۷۳ء کے دستور میں واضح الفاظ میں لکھ دیا گیا ہے کہ "پاکستان کے جمہور کو اختیار اور اقتدار اس کی مقررہ حدود کے اندر استعمال کرنے کا حق ہوگا"۔ لہذا پاکستان کے ۱۹۷۳ء کے دستور کے مطابق تمام تر اختیارات اور اقتدار آپ کو سونپ دیے گئے ہیں۔ آپکو حق حاصل ہے کہ آپ ان کا استعمال کرتے ہوئے اپنے حقوق لیں، لیکن یاد رکھیں ان اختیارات کے ساتھ آپکو یہ بھی کہا گیا ہے کہ مقررہ حدود میں رہتے ہوئے آپ تمام تر اختیارات کا استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کے کچھ حقوق ہیں جو کہ دوسروں کے فرائض ہیں اسی طرح دوسروں کے بھی کچھ حقوق ہیں جو کہ آپکے فرائض میں شامل ہیں۔ جب ہمارے دستور نے جمہور کو تمام تر اختیارات دے دیئے ہیں تو دنیا کی کوئی بھی طاقت ہمیں ہمارے اختیارات سے مستعفی نہیں کر سکتی۔

آپ کسی ایسے ملک میں نہیں رہتے جہاں بادشاہت کا نظام رائج ہو، وہاں کے تمام تر اختیارات بادشاہ اور ملکہ کے پاس ہوں اور وہ تمام نظام چلانے کے ذمہ دار ہوں، آپکو بادشاہ اور ملکہ کو جواب دینا پڑے کیونکہ آپ ان کے ملازم ہوں گے۔ بلکہ یہ آپکی خوش قسمتی ہے کہ آپ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی جمہور ہیں اس کی بادشاہت آپکے ہاتھ میں ہے۔ کسی بھی جمہوری ملک کی جمہور ہونے کا حق حاصل ہونا بہت بڑی بات ہے مسئلہ ہے تو محض ہماری سوچ کا ہماری سمجھ کا اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں۔ دستور میں بھی لکھ دیا گیا ہے کہ آپ کے ہی پاس تمام تر اختیارات ہیں ان کو جائز طریقے سے حدود میں رہ کر استعمال کرنے کی ذمہ داری آپکے کندھوں پر ڈال دی گئی ہے۔ آپ اپنے اختیارات اس وقت استعمال کر سکتے ہیں جب آپ اختیارات کے بارے میں اور اپنے حقوق کے بارے میں آگاہ ہوں۔ کیا آپ نے کبھی پاکستان کا دستور پڑھا ہے؟ کیا آپکو معلوم ہے کہ آپ کے پاس کیا اختیارات ہیں؟ شاید ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے جنہیں اپنے حقوق کے بارے میں آگاہی ہوگی۔ ملک ہمارا ہے، حقوق ہمارے ہیں، بادشاہت ہمارے ہاتھ میں ہے، اسکا نظام کس طریقے سے چلانا ہے وہ سب دستور میں درج ہے لیکن کبھی ہم اس کو پڑھنے کی زحمت گنوارہ نہیں کرتے۔ ہمیں اپنے حقوق کے بارے میں آگاہی نہیں ہے، ہم جاننا نہیں چاہتے، پڑھنا نہیں چاہتے تو ہم کسی دوسرے کو قصوروار کیوں ٹھہراتے ہیں کہ وہ ہمیں ہمارے حقوق دے جبکہ ہمیں خود معلوم نہیں کہ ہمارا ایک دوسرے پر کیا حق ہے۔

اب اس جمہوری ملک کی جمہور ہونے کی حیثیت سے آپ تو اس ملک کے بادشاہ ہوئے۔ اب بات آتی ہے کہ اسکا ملازم کون ہے؟ اگر کبھی بادشاہ بن کر بیٹھ گئے تو کام کاج کون سنبھالے گا؟ وہ بھی نہایت سیدھی اور آسان سی بات ہے سرکاری ملازمین جو کہ سرکاری خزانے سے تنخواہیں لیتے ہیں دراصل وہ ہمیں جوابدہ ہیں کیونکہ وہ ہماری خدمت کے لیے معمور کیے گئے ہیں، جو خدمات وہ فراہم کرتے ہیں ان کو خدمات فراہم کرنے کی تنخواہ دی جاتی ہے۔ لیکن یہاں الٹی گنگا بہتی ہے وہ پولیس اہلکار جو ہمارے ہی ادا کیے گئے پیسوں میں سے تنخواہ لیتا ہے اور ہماری حفاظت پر معمور کیا گیا ہے وہ ہی ہم پر حکمران بن بیٹھا ہے۔ یہ اسکی غلطی نہیں ہے بلکہ یہ ہماری غلطی ہے ہم نے اسکو یہ نہیں بتایا کہ

اس نے کس طریقے سے چلنا ہے۔ اگر آپ کسی پولیس والے سے بات کریں تو اسکا جواب ہمیشہ یہ ہی ہوگا کہ میں آپکا ملازم نہیں، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ پولیس اہلکار ہمارے ہی ملازمین ہیں۔ ان کو جو تنخواہ دی جاتی ہے وہ پیسے کہاں سے آتے ہیں؟ اور جو ان کے افسران اور حکمران بنے بیٹھے ہیں ان کو تنخواہ کہاں سے ملتی ہیں؟ وہ کس کی خدمت کے لیے معمور کیے گئے ہیں؟ انہوں نے سرکاری عہدے پر فائز ہوتے ہوئے کیا عہد لیا تھا؟ کیا وہ عہد دستور کی پاسداری کا عہد نہیں تھا؟ اگر تھا تو دستور کے مطابق تو اس جمہوری ملک کا بادشاہ اس ملک کی جمہور ہے۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بادشاہ کا حکم ماننے سے اسکے اپنے ہی ملازم انکار کر دیں؟ یہ ممکن ہے کیونکہ اس ملک کے بادشاہ کو خود نہیں معلوم کہ اس کے ملازمین کون ہیں؟ وہ ملازمین اسکے آگے جوابدہ ہیں۔ بادشاہ کو اپنے اختیارات کا ہی نہیں معلوم۔

ملک کی بھاگ دوڑ سنبھالنے کے لیے ہمیں مختلف اداروں کی ضرورت ہے ان اداروں کو ملازمین کی ضرورت ہے، پھر ان ملازمین کے پاس تمام تر اختیارات ہونے چاہیں تا کہ وہ اس ادارے کو بہتر طور پر چلا سکیں۔ آپ نے جب تمام تر اختیارات کسی ملازم کو تنخواہ کے عوض دے دیے تو اب وہ تنخواہ لے رہا ہے اس لیے وہ آپ کے سامنے جوابدہ ہے۔ اسی طرح جب ہم اپنے اختیارات سے آگاہ نہیں ہوں گے تو انجانے میں ہم دوسروں کا حق بھی ماریں گے۔ ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس ملک میں ہونے والی خرابیوں کا ذمہ دار دوسروں کو نہ ٹھہرائیں بلکہ ہم خود دیکھیں کہ ہم میں کیا کمی ہے ہم سے کیا کوتاہی ہوگئی ہے کہ ہمارے ہی ملازمین ہمیں آنکھیں دیکھا رہے ہیں، ہمارا مال خرچ کر رہے ہیں اور ہم خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اب آپ جمہور ہیں آپ تو بادشاہ ہیں ناں؟ تو آپکے پاس بھی تمام تر اختیارات ہیں آپ حکم دیں گے اور حکم کی تعمیل ہو جائے گی۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھیں کہ آپ پر بھی بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں آپ بھی جوابدہ ہیں، کیونکہ دستور کے مطابق آپکی حدود مقرر کر دی گئیں ہیں آپ نے جو کرنا ہے وہ اپنی حدود میں رہتے ہوئے کرنا ہے۔ کیا آپکو معلوم ہے کہ آپ کو کتنی آزادی حاصل ہے؟ اور آپ کے لیے کیا حدود مقرر کی گئیں ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں نہ ہم اپنے اختیارات جانیں اس کتاب کا مطالعہ کریں جس کے مصنف ہم خود ہی ہیں۔ جی ہاں! پاکستان کا آئین! جس میں ہمارے اختیارات درج ہیں جس کی رو سے ہم اس جمہوری ملک پاکستان کے بادشاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آپکو بادشاہت کیوں نہیں ملتی؟ مثال کے طور پر ایک چوکیدار ہے جو کہ آپکے گھر کی حفاظت پر معمور ہے، وہ صرف اسی شخص کو اندر آنے کی اجازت دے گا جس کو آپکی جانب سے گھر میں داخل ہونے کی اجازت ہوگی۔ اگر آپ اسکو ہدایات دیتے ہیں کہ فلاں شخص کو گھر میں داخل نہیں ہونے دینا اور پھر بھی وہ اسکو داخل ہونے دیتا ہے تو اس کے لیے وہ ذمہ دار ہے اور جوابدہ ہوگا۔ اگر آپ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو اندر آنے کی اجازت ہے اسکو باہر نہیں روکنا تو چوکیدار اگر اس شخص کو روک لیتا ہے تب بھی وہ آپکے سامنے جوابدہ ہے۔ لیکن اگر وہ شخص جو آپکی اجازت سے گھر میں داخل ہوا ہے اور اسکے بعد وہ آپ کو نقصان پہنچاتا ہے تو اسکے قصوروار آپ ہیں اس کے لیے چوکیدار جوابدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس نے آپکی مرضی سے کسی بھی شخص کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت دی ہوگی۔ اس لیے باقاعدہ ایسے نظام تشکیل دینے کی ضرورت ہے جس میں حکومتی ادارے ہمارے جوابدہ ہوں کیونکہ ہم اس ملک کے بادشاہ ہیں ہم حکومتی اداروں کو تنخواہ دیتے ہیں وہ ہمارے ملازمین ہیں ہم ان کے ملازمین نہیں ہیں۔ وہ قانون کے مطابق ہمارے آگے جوابدہ ہیں، بشرطیکہ ہم تمام تر قانونی تقاضوں سے آگاہ ہوں اور اپنی مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے اپنے اختیارات کا استعمال کریں۔

پاکستان کے موجودہ حالات کے قصوروار آپ ہیں کیونکہ آپ ہی اس ملک کے بادشاہ ہیں۔ سانحہ پشاور، کوئٹہ ہزارہ برادری، ماڈل ٹاون لاہور، کراچی ٹارگٹ کلنگ، لاہور یو حنا آباد اور ایسے ہی بے شمار واقعات ہیں جن کا اگر تذکرہ کیا جائے تو پاکستان کے چند ہی شہر ہوں گے یا شاید شہر بھی کیا دیہات ہوں گے جن میں انسانی بربریت نہ پھیلائی گئی ہو۔ ان سب کے باوجود لوگ معمول کے مطابق زندگی کی دوڑ میں مصروف ہیں۔ وہ یہ ہی سوچتے ہیں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کیا اسی کو فطرت کہتے ہیں؟ آخر کب تک؟ یہ

مظالم ہم کب تک سہتے رہیں گے؟ کب تک برداشت کرتے رہیں گے؟ اگر کوئی دل دہلا دینے ولا واقعہ ہوتو کیا اس میں ملوث ہونے والے لوگوں کو دوسرا موقع فراہم کیا جانا چاہیئے ؟ اگر ہم دوسروں کے درد اور ان کے ساتھ کی جانے والی سفا کی کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو کل کو یہ سب ہمارے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ آج ہمارے ملک کے قانونی اداروں میں کام کرنے والے اور ان اداروں کو چلانے والے اس بات سے غافل نہیں پھر بھی کوئی مناسب لائحہ عمل کیوں اختیار نہیں کیا جاتا؟ ہوسکتا ہے کہ وہ اس بات پر عمل کرتے ہوں کے وہ پیدا تو غریب ہوئے ہیں اس میں ان کی غلطی نہیں لیکن اگر غربت میں ہی مر گئے تو بہت بڑی غلطی کریں گے۔ اس لیے وہ لوٹ کھسوٹ کرتے ہیں اور اس میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ ملک کا تقریباً ہر نوجوان یہ جانتا ہے کہ سرکاری اداروں جن میں خصوصاً قانونی ادارے شامل ہیں دراصل وہ ہی ملک وقوم کو نقصان پہنچا رہے ہیں اس کے پیچھے کوئی اور وجوہات نہیں ہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ کہ اس ملک کا بادشاہ خوابِ غفلت سے ابھی بیدار نہیں ہوا۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

Photo Credits

قانون سب سے بالاتر ہے!

http://www.google.com.pk/imgres?imgurl=http://mup.vladars.net/vtk/pics/judgeHammer.gif&imgrefurl=http://ishareimage.com/judge-hammer.asp&h=356&w=362&tbnid=ecnB0FoCs7BQqM:&zoom=1&docid=Afs40yvgzy_c5M&hl=en&ei=-V1cVcXTJNfnuQSGyYD4Bg&tbm=isch&ved=0CHAQMyg3MDc

مارنے والا بھی ہے مرہم رکھنے والے کی صفوں میں!

https://twitter.com/_zackistan/status/545252724179099648

کچھ جیلوں کے حوالے سے

http://www.google.com.pk/imgres?imgurl=http://mountaintv.net/wp-content/uploads/2015/02/Prisoner%252Bin%252Bjail%252Bcell%252Bprison.jpg&imgrefurl=http://mountaintv.net/criminal-prisoner-involved-in-nanga-parbat-attack-killed/&h=400&w=630&tbnid=YfNxeaedESqnPM:&zoom=1&docid=ZSPHWVCevipNzM&hl=en&ei=W8oTVd6zPIvxatnGgegL&tbm=isch&ved=0CE0QMygXMBc

ڈیڑھ اینٹ کی مسجد

http://www.google.com.pk/imgres?imgurl=http://www.kabobfest.com/wp-content/uploads/2011/12/200606275Dimg_9243.jpg&imgrefurl=http://www.kabobfest.com/2011/12/chained-childhoods-2.html&h=533&w=800&tbnid=6EtR3tkPWe84dM:&zoom=1&docid=odR3Zue6hGa0bM&hl=en&ei=Mfg1Vf3hPIiH8QWduIGgDw&tbm=isch&ved=0CCcQMygLMAs

ملالہ سے نفرت اور عافیہ سے محبت کیوں؟

http://www.google.com.pk/imgres?imgurl=http://upload.wikimedia.org/wikipedia/commons/4/43/Afia-grad-01a.jpg&imgrefurl=http://en.wikipedia.org/wiki/Aafia_Siddiqui&h=207&w=188&tbnid=xFKyyv75sLo52M:&zoom=1&docid=SQMnPadYQGWIAM&hl=en&ei=tv8YVa-bINPbaLjRgYAB&tbm=isch&ved=0CCgQMygAMAA
http://www.google.com.pk/imgres?imgurl=http://www.youthforhumanrights.org/sites/default/files/malala-yousafzai.jpg&imgrefurl=http://www.youthforhumanrights.org/news/2014-malala-yousafzai.html&h=775&w=1240&tbnid=tO3UeSH4YtsitM:&zoom=1&docid=n0BUoNepC3oWMM&hl=en&ei=hf8YVYDTNI_OaLWugrgP&tbm=isch&ved=0CC4QMygAMAA

دیر سے آئے پر کیا درست آئے جناب؟

http://taqwaislamiccentre.com/pictures-gallery/%D9%85%DB%8C%DA%88%DB%8C%D8%A7-%D8%A7%D9%88%D8%B1-%D8%B3%D9%88%D8%B4%D9%84-%D9%85%DB%8C%DA%88%DB%8C%D8%A7-%DA%A9%DB%92-%D8%B2%DB%8C%D8%B1-%D8%A7%DB%81%D8%AA%D9%85%D8%A7%D9%85-%D8%A7-%D9%81%D8%B7%D8%A7/#prettyphoto[fancygallery-2-4]/1/

عدالت کی تاریخ: فوج سے مانگو!

http://www.google.com.pk/imgres?imgurl=http://i1.tribune.com.pk/wp-content/uploads/2015/02/837623-___n-1423802430-616-640x480.jpg&imgrefurl=http://tribune.com.pk/story/837623/military-courts-top-court-wants-statements-filed-in-10-days/&h=480&w=640&tbnid=lcF8-OEQOcQw7M:&zoom=1&docid=SpKQWXG33351AM&hl=en&ei=cgYZVZ3QBNHmaNP0gvAG&tbm=isch&ved=0CDkQMygYMBg

شکیبیاں

حکومت اور احتساب

نوجوانوں سے متعلق

ادارے سے آگاہی

انڈ ویجوئل لینڈ پاکستان ایک متحرک ، غیر جماعتی اور غیر منافع بخش رجسٹرڈ سول سوسائٹی ادارہ ہے۔اس کا بورڈ کل پانچ ارکان پر مشتمل ہے، جبکہ روزمرہ کے معاملات اس ادارے کے ڈائریکٹر کی ذمہ داری ہے۔ قیام سے لے کر آج تک اس ادارے نے حکومتی انتظامات، قانون کی بالادستی، میڈیا اور مراسلاتی، ہنر، سول سوسائٹی کے استحکام اور جمہوریت کی ترقی کے لئے کام کیا ہے۔

انڈ ویجوئل لینڈ نے واضح طور پر قانون دانوں اور دیگر سول سوسائٹی اداروں کے ساتھ مختلف حیثیتوں میں کام کیا ہے اور خصوصاً میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد کی تربیت کے حوالے سے اس کا نام پورے پاکستان میں جانا جاتا ہے۔

اشاعت

میڈیا سے متعلق

تنازعاتی تجزیے اور انتہا پسندی کے خاتمے سے متعلق

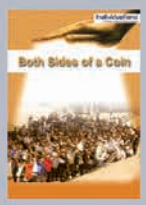

فرد میگزین

پاکستان پولیس خواتین

اگلی اشاعت اکتوبر ۲۰۱۵ء میں

Find us
Individualland
Individualland